انیس قدوائی
اب جن کے دیکھنے کو....
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اب جن کے دیکھنے کو...

انیس قدوائی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی 110025 ، اُردو بازار، دہلی 110006
پرنس بلڈنگ، بمبئی 400003 ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

بار اوّل اپریل ۱۹۸۰ء قیمت 12/50

برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی 110002 میں طبع

فہرست

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ

(اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان اُدلتے بدلتے رہتے ہیں)

پیش لفظ

انیسویں صدی کا محبت، اخلاص اور ازانفری سے بھرپور دور اپنی دم بھری کہانیوں کی بدولت جہاں تاریخ کا جزو بنا، وہیں اس مردم خیز زمانے نے ایسی ایسی شخصیتیں بھی ہندستان کو تفویض کیں جنھوں نے تاریخ، صحافت، علم، سیاست اور شعر و ادب کی دنیا کو بھی مالامال کر دیا۔

اگلے صفحات میں آپ جن قابلِ قدر ہستیوں سے روشناس ہوں گے، وہ سب انیسویں صدی کی پیداوار اور بیسویں صدی کی تاریخ ساز شخصیتیں تھیں۔ ان کی علمی قابلیت، اخلاقی کردار، تدبر، خوش ذوقی، دنیا سے محبت بھرا لگاؤ اور دینی خوش عقیدگی موجودہ دور میں شاید عجیب معلوم ہو، لیکن وہ اُس وقت ہمیں آئیڈیل، موزوں اور خالص ہندستانی پیداوار کی حیثیت سے بہت محبوب تھے۔

شاید راہ کے نشیب و فراز کی پیچیدگیاں نئی نسلوں کو اس شاہراہ سے ہٹا دیں گی، کبھی نہ کبھی منزل کی نشان دہی کے لیے وہ نقشِ قدم تو ڈھونڈھنا ہی پڑیں گے۔
لکھنے کا کوئی مقصد ہونا چاہیے، لیکن ماضی کو دہراتے وقت اکثر مقصد نگاہ

سے اوجھل ہو کر صرف خاکہ یا افسانہ رہ جاتا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ قارئین اس میں سے اپنی پسند کی یا ضرورت کی کوئی بات چن لیں۔ صفحاتِ کا غذ پر اُجاگر ہونے والوں کی خاک مٹی میں مل چکی۔ بس یہ اندیشہ ہے کہ کہیں یہ ویرانے دیوانوں کا تختۂ مشق نہ بن جائیں۔ بقولِ صفی لکھنوی

آج دیوانہ اُڑاتا ہے جو ویرانے کی خاک
کل اُڑائے گا یوں ہی ویرانہ دیوانے کی خاک

اس لیے اس خاک کو سمیٹ، عزّت واحترام کے ساتھ نذرِ گلستاں کر رہی ہوں۔

انیس قدوائی

ولایت علی "بمبوق"

سہیل صاحب! آپ نے میرے والد ولایت علی 'بمبوق' کے بارے میں پوچھا ہے۔ پہلے یہ ایک ضروری تصحیح کر دوں کہ "میر ولایت علی" سرسید اور سید محمود کے دور کے علی گڑھ کالج میں استاد تھے۔ اور میرے والد "شیخ ولایت علی قدوائی" وہاں ایک طالب علم کچی بارک علی گڑھ کے کھلنڈروں میں اپنی ذہانت، ظرافت اور تحریری شوخی کو 'بمبوق' کے فضول سے لقب میں چھپا کر کامریڈ کے گپ کالم اور 'نیو ایرا' کا مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہی کیا ہے جو بتاؤں۔ بارہ سال کی عمر میں سوا چند دھندلی یادوں کے اور مجھے ملا ہی کیا تھا لیکن اس وقت یادوں کے ذخیرے میں سے ایک تندرست سرخ و سفید چہرہ اُبھرتا ہے۔ خوب اونچا قد، بھرا ہوا جسم۔ سر پر سیاہ کسی قدر گھنگھرالے بال اور سفید بُراق سا لباس۔ یہ ہیولا کبھی سفید انگرکھے اور دو پلی چکن کی ٹوپی میں کبھی جامدانی اور جامہ وار کی شیروانی، ڈھیلی مہری کے پاجامے اور مخملی جوتے میں نظر آتا ہے، کبھی دوستوں کی محفل میں قہقہے لگاتے ہوئے، کبھی موکلوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے اور کبھی زنان خانے میں ماں بہنوں کے جھرمٹ میں۔ یہ تھے ولایت علی 'بمبوق'۔ بس یہی حلیہ اس وقت نظروں میں ہے۔

قدامت پسند خاندان کے سخت ترین دستور کے مطابق میں اپنے باپ سے زیادہ بابا سے، چچاؤں سے اور چچیرے بھائیوں سے بے تکلف تھی، باپ تو شاید میرے بڑھتے

ہوئے تد سے بھی شرماتے تھے۔ لیکن کبھی کبھار بزرگوں کی غیر موجودگی میں مجھ سے بھی مخاطب ہو جاتے تھے، ورنہ میری ان سے گفتگو ہی بہت کم ہوتی تھی۔ لاڈ پیار کا کیا ذکر۔ میں نے تو جو کچھ سنا، اپنی ماں سے، بزرگوں سے اور والد کے دوستوں سے سنا۔

جولائی ۱۹۱۸ء کی ایک رات ہیضے کی وبا نے ہمارے گھر سے برسوں کے لیے ہنسی، قہقہے اور اطمینان سکون ختم کر دیا اور شاید میری اٹھائیس سالہ بیوہ ماں کے لیے زندگی کے آخری لمحے تک۔

دادی چوں کہ دھوم دھام سے ان کی سال گرہ منایا کرتی تھیں، اس لیے انھیں سے معلوم ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۳۲ سال کی تھی۔

شیخ زادوں کے ایک قبیلے میں جن کا اپنے مورثِ اعلا قاضی قدوۃ الدین کی وجہ سے "قدوائی" لقب قرار پایا تھا، ممتاز علی صاحب زمین دار کے گھر غالباً ۱۸۸۴ء یا ۱۸۸۵ء میں ولایت علی صاحب پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی، عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر گورنمنٹ اسکول بارہ بنکی سے انٹرنس پاس کیا اور اینگلو محمڈن کالج علی گڑھ سے انیس سال کی عمر میں بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ اکیس یا بائیس سال کی عمر میں ۱۹۰۶ء میں ایل۔ ایل۔ بی مکمل کر کے بارہ بنکی میں آکر وکالت شروع کر دی تھی۔

قدوائیوں کے اس خاندان نے سرسید کی تعلیمی تحریک سے متاثر ہو کر شاید بہت جلد انگریزی تعلیم شروع کر دی تھی کیوں کہ 'بمبوق' صاحب کے بڑے بھائی کسی ضلع میں تحصیل دار تھے اور ایک پھوپھی زاد پہلے سے بارہ بنکی میں وکالت کر رہے تھے۔ عورتوں کی تعلیم کے متعلق بھی اس خاندان کے خیالات بدل چکے تھے۔ اسی لیے بمبوق کی شادی میں بھی ذرا دشواری پیش آئی۔ پہلے انھوں نے بچپن کی منگیتر سے شادی کرنے سے انکار کیا۔ پھر ایک راجا صاحب کے یہاں شادی پر راضی نہ ہوئے۔ اور آخر کار ۱۹۰۷ء میں میری والدہ سے ان کی شادی ہوئی جو اس زمانے

کی پڑھی لکھی خوبصورت لڑکی تھیں۔ خوبصورت خط لکھتی تھیں اور اپنے ساتھ کتابوں کے کئی سٹ جہیز میں لائی تھیں۔

میں نے پہلے ہی بتایا ہے، یہ زمین داروں کا گھرانا تھا، مگر زمین داریاں روز بہ روز سودی دستاویزوں اور رہن و بیع ناموں کی گراں باری کے بوجھ تلے دب کر چُرمُر ہو رہی تھی۔ اب بھی کئی گاؤں باقی تھے اور ان پر ولایت علی صاحب اور ان کے بھائی پرونوٹ لکھا کرتے تھے۔ اس سے پہلے دادا بھی اس پر فیاضیاں کر چکے تھے۔

ان دنوں آفاتِ ارضی و سماوی نے بھی یو۔پی کے دیہاتوں کو گھیر رکھا تھا کبھی طاعون صفایا کر دیتا تھا اور کبھی ہیضہ پرے کے پرے صاف کر دیتا تھا۔ ہیضے کا ٹیکہ بھی شاید اس وقت دہلی، بمبئی سے آگے نہ بڑھتا تھا۔ لکھنؤ میں کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے ڈاکٹر مختار احمد انصاری آئے تھے اور اس میں 'بمبوق' صاحب کو بھی شرکت کرنی تھی۔ بیماری کی اطلاع پہنچی تو وہ اور چودھری خلیق الزماں بھاگے ہوئے بارہ بنکی آئے۔ مگر یہاں آخری گھڑیاں گزر رہی تھیں۔ مطلوبہ انجکشن تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکا۔ مجبوراً ڈاکٹر انصاری نے کسی دوسری دوا سے کام لینا چاہا۔ رگ نہ ملنے کی وجہ سے شاید ذرا سی نس کاٹ کر انجکشن اور گلوکوز پہنچایا لیکن وقت پورا ہو چکا تھا۔ دعا اور دوا کسی نے کام نہ دیا۔ 'بمبوق' نے اپنے خورد سال بچوں، بڈھی ماں، جوان بیوی اور عاشق زار دوستوں سے منھ موڑ کر سفر آخرت اختیار کر لیا۔ اس واقعے کا سب سے عجیب منظر حافظے میں اب بھی محفوظ ہے کہ انجکشن کی جگہ سے خون بہنا بند ہی نہ ہوا۔ اور دوسرے دن مسولی میں کفن پر بھی خون کے دھبے نمودار ہو گئے تو ان کے چچا "شہید بیٹا" کہہ کر رونے پیٹنے لگے۔

میرے علاوہ اور بھائی بہن اس قابل ہی نہ تھے جنھیں آخری دیدار کرایا جاتا۔

ان میں سب سے چھوٹا صرف دو سال کا تھا۔ مگر بہت سے غم زدوں میں دو بلک بلک کر رونے والی بچیاں ڈپٹی وحید مرحوم کی بھی شامل تھیں جو ایک دو ماہ پہلے دسنہ (بہار) سے اپنے مشفق چچا 'بمبوق' کو دیکھنے آئی تھیں۔ ہم ان سے پھر کبھی مل نہ سکے۔ مگر خط کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور رفیع صاحب مرحوم کسی نہ کسی طرح ان کی خبر لیتے رہے۔

بہرحال اس ٹریجڈی کے بعد ان بکثرت خطوط سے، پُرسے کے لیے آنے والوں کی بھیڑ سے اور بہت سے اَن جانے مغموم چہروں سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ہمارا باپ اس چھوٹے سے گانو یا اس ضلع کی کوئی غیر معمولی شخصیت تھا۔ وہ صرف ہمارا نہیں، بہت سے یتیموں کا باپ، غریبوں کا سرپرست، طالب علموں کا دست گیر بھی تھا۔ دوستوں کے وسیع حلقے میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ بہار، بنگال، حیدرآباد اور یو۔پی کے اکثر شہروں کے لٹریری دوستوں نے، سیاسی لیڈروں نے اور قوم پرست نوجوانوں نے اپنے خطوط میں اس خلا کا ذکر کیا جو اُن کی محفل میں پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ نے ان کے مضامین اور تقریروں کی کٹنگ بھیجیں۔ مسلم لیگ کونسل اور کانگریس کمیٹی کے تعزیتی ریزولیوشن بھی آئے اور وہ سب رفیع صاحب اور ان کے والد پڑھتے اور سینت سینت کر رکھتے رہے۔ رفیع بھائی نے 'بمبوق' کے مضامین اور خطوط بھی جگہ جگہ سے حاصل کیے۔ اشاعت کا ارادہ تھا، مگر اُن کی خود طالب علمی کا زمانہ تھا اس لیے کچھ تاخیر ہوئی اور ۱۹۲۱ء سے جو دارو گیر شروع ہوئی، اس میں ہمارے خاندان پر تلاشی، قرقی اور گرفتاریوں کا دَور شروع ہو گیا اور رفیع بھائی کے سامان میں وہ بکس بھی چلا گیا جس میں یہ قیمتی مسودات محفوظ تھے۔ جیل سے واپس آکر رفیع صاحب نے بہت کوشش کی مگر کوئی چیز واپس نہ مل سکی۔ شاید ضلع کے انگریز کلکٹر نے غصّہ اور انتقامی جذبے کے تحت سب میں آگ لگوادی تھی۔ اور یوں بدلیشی کپڑوں کی ہولی کا

بدلہ لیا تھا۔

دادی کہتی تھیں، ولایت میاں جیسا کوئی بچّہ آج تک اس خاندان میں پیدا نہیں ہوا۔ وہ بچپن سے ذہین تھے۔ ہر بات پر سوچتے اور غور کرتے تھے چھوٹی عمر میں خدا کی ہستی و رسالت اور اپنی انفرادیت پر سوچ بچار کیا کرتے تھے اور یہ گفتگو سُن کر ہم لوگ سوچتے تھے کہ ہر ماں کو اپنا بچّہ غیر معمولی لگتا ہے۔ یہ سب باتیں ان کی محبت ان سے کہلوا رہی ہے۔

ایک دن رو رو کر ایک دلچسپ قصّہ سُنایا کہ قیامت میں پُل صراط پر چلنے اور خدا کے گھر اعمالِ انسانی کی نیکی بدی کو ترازو میں تُلنے کی بات ہر مسلمان بچّہ سُنتا ہے۔ جانتا ہے اچھائی بُرائی میں سے جس کا پلڑا بھاری ہوگا اسی حساب سے جنت اور دوزخ ملے گی۔ مگر میرا ولایت آٹھ سال کا تھا، جب اُس نے ایک دن زار و قطار رونا شروع کر دیا کہ میں تو سخت گنہ گار ہوگیا۔ اب نہ بخشا جاؤں گا۔ پوچھا گیا۔ آخر کیوں؟ کہنے لگے میرے دل میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں بُرے بُرے خیالات آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے، جیسے اللہ میاں ترازو لیے بیٹھے تول رہے ہیں۔ باپ، چچا، بھائی سب نے بہتیرا سمجھایا کہ دل سے خیال نکال دو۔ توبہ کر لو۔ بچّے معصوم ہوتے ہیں۔ اللہ رحیم ہے، معاف کر دے گا۔ مگر وہ یہی کہتے رہے، کیا کروں۔ دل سے خیال نہیں نکلتا اور گناہ ہو رہا ہے۔ پتا نہیں پھر کیسے اس فکر سے چھٹکارا ملا۔ شاید اس زمانے میں بچّوں کو سمجھانے، ڈرانے اور پڑھانے کا ڈھنگ اور بڑوں کو سمجھانے کا طریقہ ایک ہی استعمال ہوتا تھا اور ذہین بچّے کو بلا وجہ خدا کی خوف ناک ہستی کا تصوّر دے دینا کتنا بڑا ظلم تھا۔ آج کل پڑھی لکھی ماؤں کو بھی ذہین بچّوں کو سمجھانے میں کافی مشکل پیش آتی ہے۔ اس زمانے میں سیدھی سادی ماں یہ تو سمجھ گئیں، بچّہ غیر معمولی ہے مگر تعلیم و تربیت اور پرورش عام ہی انداز سے ہوتی رہی۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ علم کا شوق،

سب کچھ جان لینے کی آرزو اور اپنی رائے پر اعتماد بڑھتا ہی گیا۔

جہاں تک میں نے دوستوں کی زبانی سُنا 'بمبوق' علی گڑھ کے ابتدائی دَور کے راسخ العقیدہ اللہ رسولؐ اور اسلام کے عاشق، مگر مولویت سے کوسوں دُور جدید ذہن و فکر رکھنے والے انسان تھے۔ ڈاکٹر سیّد محمود کہتے تھے کہ ۱۹۰۸ء میں جب علی گڑھ کے طلبہ میں قوم پرستی کا پرچار زوروں پر تھا تو بمبوق کالج چھوڑ چکے تھے مگر تحریری رشتہ مضبوطی سے قائم تھا۔ سودیشی مال کی تحریک اس وقت کوسوں دُور تھی مگر فطری حُبّ الوطنی ان کو مجبور کرتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ اپنے ملک کا بنا ہوا کپڑا استعمال کریں۔ حالاں کہ اُس وقت کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں انگریزی فیشن اور لب و لہجہ اختیار کرنے کا شوق عام تھا، مگر مجھے یاد نہیں آتا کہ میرے والد نے کبھی اُردو انگریزی زبان ملی جلی استعمال کی ہو۔ شاید یہ وجہ بھی ہو کہ ان کے پاس الفاظ کی کمی نہ تھی۔ لباس میں صرف ترکی ٹوپی تو غیر ملکی تھی، باقی خالص ہندستانی۔ صفائی کا یہ عالم تھا کہ دن میں دو جوڑے بدلتے، مگر گھر میں آنے والے ہر میلے کچیلے گنوار مہمان سے بھی گلے مل لیا کرتے تھے۔ بہت ہی سادہ بغیر مرچ کا کھانا اور تھوڑے پھل ان کی غذا تھی۔ لیکن میری فراخ دل ماں کو پچاس ساٹھ آدمیوں کا ایک وقت میں کھانے کا بندوبست کرنا پڑتا تھا۔

وکالت میں کیا اور کتنی کمائی تھی، مجھے معلوم نہیں، مگر اس وقت بارہ بنکی [illegible] وکلا میں وہ [illegible] سے زیادہ مشہور مقبول اور نمایاں تھے اور مفت مقدمہ کرنے [illegible] تو شاید ان کا [illegible] صوبے میں کوئی نہ تھا۔ تباہ حال موکل آتے، ہفتوں ٹھہرتے، [illegible] تے پیتے، مقدمہ [illegible] ٹتے اور اپنے گھر واپس جا کر لڈو کی ہانڈی، مٹھائی کی ٹوکری، وہ [illegible] ا بنے گنے کی ایک [illegible] نڈی شکر [illegible] میں بھجوا دیا کرتے تھے۔

[illegible] الب علم لڑکے بھی ساتھ رہنے [illegible] سگے بھائی کے بچوں

کو چھوڑ کر ان میں کوئی پٹواری کا بیٹا تھا، کوئی منشی جی کا بھتیجا، کوئی گاؤں کے غریب کا بچہ، کوئی چچیرا، کوئی ممیرا۔

لیکن گھر میں سب سے زیادہ چہیتے اور ذی عزت رفیق صاحب تھے۔ ان کی عقل و سمجھ پر چچا اور چچی دونوں کو بھروسا تھا اور وہی ان کے دست و بازو تھے۔ چھٹیوں میں دو ماہ مستقل وہ چچا کے پاس گزارتے تھے۔

اس انبوہ میں بمبوق کا علمی ذوق اور سیاسی شعور بھی پروان چڑھ رہا تھا۔ "خدام کعبہ" کی تحریک شروع ہوئی تو ایک زبردست میٹنگ مولانا محمد علی شوکت علی کے آنے پر انھوں نے بلائی۔ اور اس کے بعد ہی وہ دونوں بھائیوں سے ملنے چھندواڑہ گئے اور کئی دن ان کے ساتھ رہے۔ حکام کی لاعلمی میں تو نہ ہوا ہوگا مگر صوبے کی حکومت نے شاید سخت نوٹس لیا اور ۱۹۱۸ء تک ان کے پیچھے سی۔ آئی۔ ڈی لگی رہی۔ کیوں کہ ہمارے گھر اکثر یہ ذکر ہوتا تھا کہ ۱۹۱۰-۱۱ء میں ہندی اردو کے قضیے میں کلکٹر ضلع اور حکام سے لڑ کر انھوں نے........ اپنے پیچھے مخبر لگا لیے تھے اور اب بھی نہیں مانتے ہیں دیکھو کیا ہو، کہیں محمد علی، شوکت علی کی طرح سرکار ان کو بھی پکڑ کر بند نہ کر دے۔

یہ واقعہ تھا کہ سرکاری دفاتر ہندی میں کر دینے کی تحریک مالویہ جی اور ہندو مہاسبھا سے شروع ہوئی۔ اس وقت تک ہمارے صوبے میں دفتری کام سب انگریزی اور اردو میں ہوتے تھے اور "بمبوق" کاروباری زبان بدستور اردو انگریزی میں قائم رہنے کے حق میں تھے۔ اس لیے سخت کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس لیگ پیکٹ اور کانگریس سیشن نے اور ان کی سرگرمیوں نے حکومت کو چوکنا کر دیا۔ دو آزاد خیال ہفتہ وار اخبارات "کامریڈ" اور "نیو ایرا" سے گہرا تعلق ہونے کی بنا پر حکومت وقت نے انھیں باغیوں اور مخالفوں میں شمار کر لیا تھا۔ ادھر اس دور کی اکثر تحریکی

اور سیاسی تحریکوں میں شمولیت کی وجہ سے روز بہ روز ان کی دل چسپی وکالت سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ انھیں دنوں 'نیوایرا' کے ایڈیٹر راجا غلام حسین کا انتقال ہو گیا اور 'نیوایرا' بند ہو گیا۔ کامریڈ پہلے ہی معتوب ہو کر بند ہو چکا تھا۔ سب قوم پرست احباب کی نظریں 'بمبوق' پر پڑنے لگیں۔ شاید ایک نئے قومی آزاد خیال اخبار کی تیاریاں شروع بھی ہو چکی تھیں مخلص دوستوں سے مشورے ہو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا بہت جلد سیاسی زندگی میں شمولیت کا ارادہ کر رہے ہیں۔ مگر قضا نے مہلت ہی نہ دی۔ پارلیمنٹ کی ممبری کے زمانے میں جس صوبے میں بھی گئی، وہاں کوئی نہ کوئی بزرگ 'بمبوق' صاحب کے دوست کی حیثیت سے مجھ سے ضرور ملے۔ ایک صاحب فرمانے لگے، بھئی واہ کیا ظریف آدمی تھا اور مزاج بھی کتنا لطیف اور سلجھا ہوا۔ ایک واقعہ سنو ــــ دیوہ شریف کی نمائش میں جانوروں کا میلا لگا ہوا تھا۔ ایک صاحب میلا دیکھ کر واپس آئے تو بیل بھینس گائے گھوڑے سب کی تعریف کرتے کرتے کہنے لگے، اور تو اور گدھے بھی اتنے تندرست اور خوبصورت آتے ہیں کہ بس دیکھتے ہی رہ جائیے۔ وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ تمھارے والد داخل ہوئے اور بے ساختہ کہا "بھائی آپ کیا خودستائی فرما رہے ہیں۔" اتنا سننا تھا کہ کہنے والے صاحب تو کھسیانے ہو گئے اور ہم سب دیر تک اس جملے سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ لیکن چھوڑیے مزاح کی اس نزاکت و لطافت کو اس دور میں کوئی کیا خاک سمجھ پائے گا یا لطف اندوز ہو سکے گا۔ اس لیے مجھے معلوم نہیں اگر ان کے مضامین "اسیسر" اور "پٹواری" وغیرہ شائع کیے جائیں تو لوگ انھیں پسند بھی کریں گے یا نہیں؟ ان کے انتقال پر تو اخبارات نے لکھا تھا 'بمبوق' کی تحریریں برنارڈ شا اور چیسٹرٹن کا رنگ جھلکتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے میں کامریڈ اور 'نیوایرا'، 'جمہور' اور 'معلومات' کا انتظار اکثر اس کے گپ کالم اور انگریزی اردو مضامین کی وجہ سے ہوتا تھا۔ 'جمہور' قاضی عبدالغفار کا اخبار تھا اور 'معلومات' حکیم

عبدالوالی صاحب کا ماہ نامہ ۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی نے 'اسیسر' اور 'پٹواری' دونوں مضامین کا اُردو ترجمہ "ہمدرد" میں بھی شائع کیا تھا۔ ابھی حال میں جامعہ ملیہ کی لائبریری سے اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے کتب خانے سے ان کے کچھ انگریزی مضامین دست یاب ہوئے ہیں جو ان کے چھوٹے بیٹے جمال قدوائی کے پاس محفوظ ہیں۔

ان مضامین میں اس دَور کے نظامِ حکومت پر ارکانِ حکومت اور رسوسائٹی پر مذہب کے خود ساختہ ٹھیکے داروں پر تیکھی اور طنزیہ چوٹیں ہوا کرتی تھیں۔ میرا خیال ہے ان کی انگریزی تحریر کا اسٹائل بہ نسبت اُردو کے زیادہ بہتر تھا۔ اگرچہ وہ بھی اب بہت پُرانا ہو چکا۔

ان کے وسیع حلقۂ احباب میں، ڈاکٹر سیّد محمود، ڈپٹی وحید مرحوم، زکریا صاحب، مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ و ہمدرد، چودھری خلیق الزماں، حکیم عبدالوالی ایڈیٹر معلومات، قاضی عبدالغفار ایڈیٹر جمہور، مہدی افادی، عبدالرحمان بجنوری، خواجہ عبدالمجید وغیرہ بہت سارے لوگوں نے ہمیں خطوط لکھے، ملے اور ان میں سے جو زندہ رہے انھوں نے مرحوم کے دوست کی اولاد سے بھی بہتر امیدیں قائم کیں۔ چودھری محمد علی ردولوی کہا کرتے تھے، دو آدمیوں کی یاد نے میری زندگی خراب کر رکھی ہے، ایک میری بیوی مرحومہ دوسرے ولایت۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے ان کی ادبی نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ کیوں کہ ماجد صاحب اس وقت فلسفی عبدالماجد تھے اور اس دورِ تشکیک و فلسفہ میں 'ببوق'، کے مزاحیہ جملوں اور طنزیہ مضامین کا نشانہ بنتے تھے اور خود ان کو اپنے طنزیہ تیروں کا نشانہ بناتے تھے۔

چودھری محمد علی مرحوم نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ ولایت علی کو علی گڑھ کالج سے، علی گڑھ والوں سے، اقبال کی شاعری سے، اپنے ملک سے عشق تھا۔ وطن کی آزادی

کی تڑپ تھی اور انگریز سرکار سے متنفر تھے۔ اتنا تو مجھے بھی یاد ہے کہ اقبال کی انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں پڑھی جانے والی اکثر تازہ نظمیں آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی برابر لاہور سے آیا کرتی تھیں۔ ان میں کی اکثر بچوّں کو یاد بھی کرائی جاتی تھیں تاکہ غیرتِ ملی اور اخوتِ اسلام کا جذبہ بیدار رہے، کیوں کہ ترکی خلافت کی تباہی نے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بہت بے چین کر رکھا تھا۔ اپنی مرنجاں مرنج طبیعت کی بدولت ضلع کے ہندو مسلمانوں میں، جاہل اور تعلیم یافتہ حلقوں میں وہ یکساں مقبول تھے۔ سب ان کے شیدائی اور وہ سب کے مخلص دوست۔

اور اب میں حیرت سے سوچتی ہوں کہ اللہ ۳۳ سال کی عمر میں تو ان کی مقبولیت، شہرت اور سرفروشیوں کا یہ عالم تھا، اگر اور جیتے رہتے تو کیا ہوتا۔ حیاتِ مستعار اتنی مختصر تھی کہ ؎

عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
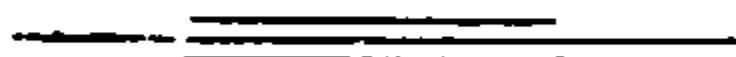
۲- رفیع احمد قدوائی

کوئی کہتا ہے رفیع صاحب بہت بڑے سیاست داں تھے، کسی نے ان کو انسان دوست کہا، کچھ لوگ ان کی انتظامی صلاحیتوں کے قائل ہیں اور کچھ ان کی عقل اور تدبیر کے۔ لیکن مجھے تو ان کے ذکر پر خواجہ عثمان ہاردنی کا قول یاد آجاتا ہے۔

"شفقت آفتاب کی سی، سخاوت دریا کی طرح اور انکساری زمین کے مثل۔ جب کسی شخص میں یہ تینوں صفات دیکھو تو سمجھ لو اللہ تعالیٰ اسے دوست رکھتا ہے"۔

اور ایسی ہی ایک بھرپور شخصیت تھی رفیع احمد قدوائی کی، جس کی ابتدا ۱۸ر فروری ۱۸۹۴ء کو چھوٹے سے گانو مسولی میں ہوئی اور ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو حیاتِ مستعار کا اختتام ہو گیا۔ ایک حقیر فانی انسان جس نے اپنی زندگی کے صرف ۵۹ سال اس دنیا میں گزارے مگر ایسے گہرے نقوش چھوڑ گیا کہ زمانہ لاکھ بھلانے کی کوشش کرے ہر نقش ابھر ابھر کر انسانیت، شرافت، فیاضی، دردمندی اور حب الوطنی کی داستان سنا جاتا ہے۔

وہ ایک ہنگامہ خیز دور تھا جس میں عمر کے تیرہ سال جیل میں کٹ گئے۔ بار بار کی گرفتاری، سزایابی، مشکلات، رکاوٹیں اور ان سب پر مستزاد دل کی بیماری۔ سوا اس کے اور کیا کہوں کہ کوئی غیبی قوت تھی جو انھیں زندہ رکھ کر ان سے کام

دے رہی تھی اور طاقتِ عمل عطا کر رہی تھی۔

رفیع صاحب نے قدوائیوں کے قبیلے کی ایک شاخ، امتیاز علی صاحب، کے گھر مسولی (ضلع بارہ بنکی) میں جنم لیا۔ کہتے ہیں شہاب الدین غوری کے عہد میں ستّر علما اور فقرا کا جو قافلہ خواجہ معین الدین چشتی کی سرکردگی میں ہندستان آیا اس میں قاضی قدوۃ الدین بھی شامل تھے۔ ایک سال تک دہلی میں قاضی القضاۃ (اب کی زبان میں چیف جسٹس) کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد اودھ چلے آئے۔ اس وقت تک یہ علاقہ شاہ دہلی کی قلمرو میں شامل نہ تھا۔ اس لیے لڑتے بھڑتے ہوئے انھوں نے اپنے ساتھیوں، بیٹوں اور غلاموں کے لیے جگہ بنائی۔ اور شاید یہ خطۂ ملک اتنا پسند آیا کہ یہیں کے ہو رہے۔ قدوائی ان شیخ زادوں کا سرنیم قرار پایا اور قرابت داریوں کے ذریعے یہاں کے سادات اور شیخ زادوں سے مربوط ہو گئے۔ اب بھی کسی قدوائی سے پوچھیے وہ اپنی جنم بھومی بارہ بنکی یا فیض آباد ہی کو بتائے گا۔ کیونکہ قاضی صاحب کے چاروں بیٹوں کی اولادیں انھیں دو ضلعوں میں آباد ہو گئیں۔

کاکوری کے شہاب الدین صاحب کا بیان ہے کہ 'رقعاتِ عالمگیری' میں ایک جگہ مذکور ہے "قدوائیاں نسب دارند حسب دارند"۔ یہ واقعہ ہے کہ دو ایک کو چھوڑ کر نہ تو ان کی کوئی بڑی ریاستیں قائم ہوئیں نہ انھوں نے تمول میں بھی عوامی سطح سے بہت اونچا اٹھنے کی کوشش کی۔ تاریخ بھی ان کے تذکرے میں خاموش ہے اور بکسر کی جنگ کے بعد سوا شجرۂ نسب کے اور کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ موضوع تحقیق طلب بھی ہے اور شاید تاریخ اودھ کا ایک گم شدہ ورق بھی۔

بعض لوگ سونے کا چمچہ منھ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں، اس لیے

بڑے آدمی کہلاتے ہیں۔ بعض بڑے آدمی بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور کچھ بڑے نہیں ہوتے مگر ان پر بڑائی لادی جاتی ہے۔

رفیع صاحب ان تینوں قسموں میں سے کسی میں بھی فِٹ نہیں ہوتے۔ وہ قدوائیوں کے ایک معزز خوش حال گھرانے میں ضرور پیدا ہوئے مگر اس وقت جب زمینداری آہستہ آہستہ مہاجنوں کے قبضے میں جا رہی تھی اور بڑے بننے کی کوشش یوں نہیں کر سکے کہ دادا، باپ اور چچا اپنی شرافت و قابلیت اور اہلیت و انصاف کا سکّہ جمائے ہوئے تھے۔

بڑے بیٹے کی سب سے بڑی اولاد ہوتے ہوئے بھی دس سال تک ان کے ساتھ عام لڑکوں کا سا برتاؤ ہوا۔ انھیں اکثر تنبیہ و تادیب کا نشانہ بننا پڑا۔ کیوں کہ بگڑے رئیسوں اور نواب زادوں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر بزرگ بہت محتاط ہو گئے تھے۔ ان اثرات سے بچانے کے لیے شاید ان پر ضرورت سے زاید پابندیاں عائد کی گئیں۔

لیکن جب چچا (ولایت علی صاحب) وکالت پاس کر کے علی گڑھ سے لَوٹے تو ان کی مردم شناس نظر نے بھتیجے کے غیر معمولی عادات و اطوار اور صلاحیتوں کو پرکھا اور خاص توجہ ان پر مرکوز کر دی۔

باپ حکومتِ وقت سے وابستہ اور تحصیل دار تھے۔ چچا باغیانہ ذہن و دماغ رکھنے والے، قومی تحریکات میں منہمک تھے۔ ان دو متضاد اثرات کے درمیان رفیع صاحب کو اپنی راہ ڈھونڈھنی پڑی۔

ویسے اپنے تمام ہم عمروں میں وہ انفرادی کردار رکھتے تھے۔ گہری خاموشی کے ساتھ دل چسپ شرارتیں ضرور رکھیں مگر چند خصوصیات کی بنا پر نو عمر گروہ بھی ان کا احترام کرتا تھا۔ مثلاً ان کی شرم و حیا، جو شاید میرے کام کیا میرے خیال

کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ سچائی کا یہ عالم تھا کہ صبر و سکون سے اپنی اور دوسرے کی غلطی پر سزا بھگت لیتے مگر دوسرے کے سر الزام تھوپ کر یا اس کا راز فاش کرکے اپنے کو بچانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

اس چھوٹی عمر میں بھی اتنے مستقل مزاج تھے کہ جس بات کو ٹھیک سمجھتے کرتے۔ بزرگوں کا رعب اور کسی کا خوف بھی اپنی بات سے ہٹنے پر ان کو آمادہ نہ کر سکتا تھا۔ اپنی ضرورت پر ہمیشہ ساتھیوں کی ضرورت و خواہش کو ترجیح دیتے اور اس کے لیے قرض لینے یا قرض دلوانے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ اور جب ڈانٹ پڑی تو کبھی یہ نہ بتایا کہ کس کے لیے مقروض ہوئے ہیں۔ جیب کا آخری پیسہ بھی خرچ کرکے سکون میں فرق نہ آیا نہ کبھی اپنی بہترین چیزوں پر غرور رہا، نہ ان کی نمائش کی۔ امیروں کی نقل اور عامیانہ طرز سے بھی ہمیشہ گریز رہا۔ بس 'میرزایانہ ادا' ھی مصلحت کی بات تھی'۔

رفیع صاحب بقولِ اقبال 'نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو' تھے۔ اور اسی لیے انھیں اپنے جذبات، خیالات اور قوتِ عمل پر پورا قابو حاصل رہا۔ وہ کام جو دوسروں کو آن ہونے اور مشکل نظر آتے، رفیع صاحب اگر ارادہ کر لیتے تو پورا کر لیتے تھے اسی لیے گھر والے انھیں ضدی کہا کرتے تھے۔ حالانکہ دوستوں کی امداد بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔

پہلی جنگِ عظیم ختم ہوتے ہی قومی تحریک نے نئی کروٹ لی۔ نظر بندی، قید، پھانسی اور کالے پانی کا دور شروع ہو گیا۔ رفیع صاحب ۱۹۱۴ء میں بارہ بنکی گورنمنٹ اسکول سے میٹرک پاس کرکے علی گڑھ چلے گئے تھے اور اس وقت بی۔ اے میں پڑھتے تھے۔ ویسے ان کا رجحان بہت دن سے اسی طرف تھا۔ ایک بار انھوں نے سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی میں شامل ہونے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔

اور چچا کی اس فہمائش سے رُک گئے تھے کہ تعلیم ختم ہونے کے بعد جو جی چاہے کرنا۔ اس کے علاوہ ۱۹۱۶ء کے کانگریس لیگ پیکٹ میں اور لکھنؤ کانگریس سیشن میں بھی اپنے چچا کے ساتھ، تماشائی ہی کی طرح سہی، مگر شریک ہوئے تھے۔ کیونکہ چچا کانگریس اور لیگ دونوں کے (اس زمانے کے دستور کے موافق) ممبر اور مفاہمت کی کوشش میں پیش پیش تھے۔

۱۹۱۷ء میں ناصر الدین حسن صاحب (نواب ناصر یار جنگ) نے ولایت علی صاحب کو کسی بڑی پوسٹ پر حیدرآباد بُلایا۔ مگر انھوں نے نہ صرف خود انکار کیا، بلکہ چودھری محمد علی ردولوی کی اس تجویز کو بھی ماننے سے انکار کر دیا کہ رفیع صاحب کی خاطر کسی جگہ کے لیے لکھ دیا جائے۔ رفیع صاحب نے خود بتایا کہ چچا نے کہا جو بات میں اپنے لیے پسند نہیں کرتا رفیع کے لیے کیوں کہوں۔ وہ بھی ملازمت نہ کرے گا۔ ایک وجہ اور بھی تھی۔ اُن دنوں ایک آزاد قومی اخبار کی ضرورت شدّت سے محسوس کی جارہی تھی۔ کامریڈ موقوف ہو چکا تھا۔ 'نیو ایرا' بھی بند ہو چکا تھا اور دوستوں میں مشورے تھے کہ کسی نئے اخبار کا اجرا کیا جائے مگر ۱۹۱۸ء میں ولایت علی صاحب کا انتقال ہو گیا۔

اتنے بڑے مددگار، شفیق اور استاد کی رحلت سے مہینوں از خود رفتہ رہنے کے بعد رفیع صاحب سنبھلے تو سیاسی ہلچل شباب پر تھی۔ تمنائیں بیدار ہونے لگیں، وہ بار بار کالج سے چلے آتے۔ لکھنؤ اور بارہ بنکی کے نوجوان ساتھی ان کی صلاح اور ہدایت کے منتظر ہوتے تھے۔ اور اب ضرورت تھی کہ کانگریس کی تحریک اور گاندھی جی کے پانچ برکات کو گانو گانو تک پھیلا دیا جائے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کاموں میں حصہ لینا دشوار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لا فائنل کے امتحان میں شریک نہ ہو سکے اور بزرگوں نے ان کی شادی بھی کر دی۔ ۱۹۲۰ء میں پھر کالج گئے۔ مگر امتحان سے

پہلے آکر ضروری کاموں میں جٹ گئے اور واپس نہ گئے۔ ایک وفادار گورنمنٹ افسر کے لیے یہی چیز کیا کم تکلیف دہ تھی کہ وہ اپنا وقت برباد کر رہے ہیں اور بغیر وکالت پاس کیے گھر لوٹ آئے ہیں۔ اس پر سے انگریز کلکٹر و کمشنر نے بلا بلا کر وارننگ بھی دینا شروع کر دی کہ اپنے لڑکے کو روکو وہ برٹش حکومت کے خلاف بغاوت پھیلاتا اور سازشیں کرتا ہے۔

ادھر گانو کے نوجوان، ضلع کے انقلابی اور خاندان کے سرپھرے منتظر تھے کہ رفیع صاحب آئیں تو جھنڈا اور اونچا کر دیا جائے۔ ۲۱ء خاصی تگ و دو اور دوڑ دھوپ کا سال تھا۔ اس میں چھ چھ میل پیدل چل کر انھوں نے ایسے مقامات پر بھی کانگریس کمیٹیاں قائم کیں، والنٹیر کور آرگنائز کیں، جہاں یکہ اور بیل گاڑی کا بھی گزر نہ تھا۔ اور اکثر ان کو لے جانے پر لوگ تیار بھی نہ ہوتے تھے۔

آخر کار دار و گیر شروع ہو گئی۔ کانگریس کے ۱۴ سال والے لاکھوں والنٹیر دیہاتوں سے نکل پڑے۔ رفیع صاحب اور ان کے ساتھی دوست و عزیز عبدالعلی صاحب قدوائی صوبائی کانگریس کمیٹی کی میٹنگ میں شریک ہونے گئے مگر نہ جانے کیسے دوست گرفتار ہو گئے اور یہ بچ کر آ گئے۔ میں نے کہا وہاں تو جتنے بیٹھے تھے سب پکڑے گئے۔ آپ کیسے بچے۔ کہنے لگے میں اس وقت کرسی پکڑے کھڑا تھا۔ ایس۔ پی نے وارنٹ دکھایا۔ میں نے کہا اس میں لکھا ہے جتنے بیٹھے ہیں سب کو گرفتار کر لو۔ میں تو کھڑا ہوں۔ اور ایس۔ پی مسکرا کر چلا گیا۔

دراصل انھیں اپنے ضلع میں سبھوں کی رہنمائی کرنی تھی۔ آخر دسمبر ۲۲ء میں رفیع صاحب مع اپنے دوستوں، عزیزوں اور بھائی کے گرفتار ہو گئے اور دونوں بھائیوں کو سزا سب سے زیادہ ملی۔

سنہ ۲۳ء میں جب رہا ہوکر واپس آئے تو زمین بہت گرم تھی۔ ابا جان اس وقت صورتِ حال سے تنگ آ گئے تھے۔ رفیع صاحب کو ایک سال کے لیے گھر چھوڑ دینا پڑا۔ حکومتِ برطانیہ بدلہ لینے پر تلی ہوئی تھی۔ تلاشی، جرمانہ، جائداد کی نیلامی اور بلا وجہ پولیس کی دوڑ نے سب کو حیران کر دیا تھا۔ اور رفیع صاحب اب اپنے والد اور بزرگوں کو مزید مشکلات میں مبتلا نہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے دونوں بھائیوں کو باہر چلا جانا پڑا۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں ان کے اکلوتے بیٹے کا انتقال ہوگیا۔ اور اپنی مخبوط الحواس بیوی کو خاندان کے بہت سے افراد کے ساتھ حج کرنے بھیج کر رفیع صاحب سی۔ آر۔ داس کے گروپ (سوراج پارٹی) میں شامل ہوکر اودھ کے ۱۲ ضلعوں سے سنٹرل اسمبلی کا الکشن لڑے اور کامیاب ہوئے۔ انھیں دنوں موتی لال جی کا ایک خط، جو رفیع صاحب کے نام تھا، ان کے والد کے ہاتھ پڑ گیا۔ خط کا انداز ایسا تھا جیسے باپ اپنے بیٹے کو یا استاد اپنے لائق ترین شاگرد کو لکھتا ہے۔ کچھ ہدایتیں تھیں اور کچھ معاملات میں ان کی رائے پوچھی گئی تھی۔ (افسوس ہے وہ خط پولیس کی دست برد کی نذر ہوگیا) اس خط نے امتیاز علی صاحب پر یہ حقیقت منکشف کردی کہ ان کا بیٹا تضیعِ اوقات نہیں کر رہا ہے، بلکہ بہت سے اہم کاموں میں ملک کے نام ور لیڈر کے ساتھ مصروف ہے۔ یہ خط ان کی تسکین کا باعث بن گیا۔ اب وہ ہر نقصان اور تکلیف اٹھانے کے لیے تیار تھے، مگر رفیع صاحب کو کسی کام سے روکنا نہیں چاہتے تھے۔

سنٹرل اسمبلی کے سیشن میں رفیع صاحب مع اپنے باورچی اور کم از کم پچاس آدمیوں کے لیے کھانے و چائے کے برتن لے کر جایا کرتے تھے۔ اور اس گھر میں بہاری، بنگالی، مدراسی، یو۔ پی والے اور پنجابی سب ہی ممبران صرف اپنے سوٹ کیس

دلستر لے کر آجاتے ۔ ڈاکٹر انصاری نے اس گھر کا نام سرائے رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے علاوہ روزانہ آنے والوں کی بھی کثرت رہتی تھی۔ ان میں کچھ صلاح و مشورہ کرنے دوسرے صوبوں سے آتے، کچھ لیڈروں سے ملاقات کرنے اور ہم جیسے صرف دہلی گھومنے جاتے ۔

رفیع صاحب کانگریس پارٹی کے اسمبلی وہپ تھے ۔ نہرو رپورٹ پر بحث مباحثہ ہو رہا تھا اور ہندستان کا نیا نقشہ بنانے پر ملک کے بہترین دماغ جٹے ہوئے تھے۔ بہت جلد پارٹی اسمبلی سے کنارہ کش ہو گئی ۔ نہرو رپورٹ کی تیاری کے سلسلے میں رفیع صاحب کو موتی لال جی کے ساتھ بحیثیت سکریٹری کام کرنا اور الہ آباد میں ٹھہرنا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں ان کے بھائی شفیع احمد مرحوم نے میونسپلٹی میں چھوٹا سا کام حاصل کر کے ایک مکان کرائے پر لیا۔ ان دنوں جواہر لال جی میونسپل بورڈ کے چیرمین ہو گئے تھے ۔ خفیہ طباعت و اشاعت کے مراحل دوستوں کی مدد سے مکان کے پچھلے حصے میں انجام پایا کرتے تھے ۔ مجھے یاد ہے پٹیل کمیٹی کی رپورٹ جو فرنٹیر کے قصہ خوانی بازار کے حادثے سے متعلق تھی، یہیں سے چھپ کر ملک میں ہاتھوں ہاتھ تقسیم ہوئی ۔

رفیع صاحب اکثر سب کے بعد بقیہ کام پورے کر کے گرفتار ہوتے ۔ کم خفتن اور کم خوردن کے ساتھ کم گفتن پر بھی وہ ان دنوں اس حد تک عامل تھے کہ کوئی تقریری تحریری ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے اکثر دو دو ماہ حوالات میں پڑے رہتے اور پولیس ریمانڈ پر ریمانڈ لیتی چلی جاتی ۔

نمک ستیہ گرہ میں پکڑے گئے، تو کافی دن حوالات میں گزر چکے تھے۔ جب ایک دن ان کے کلاس فیلو مجسٹریٹ مسعود نے جھلا کر کہا رفیع کیوں پریشان کرتے ہو بتا دو۔ جھگڑا ختم ہو۔ مسکرائے اور کہا ثبوت تلاش کرنا پولیس کا کام ہے

میں کیوں بتاؤں ۔ناچار انھوں نے چھ ماہ کی سزا دے کر چھٹکارا حاصل کیا۔
ایک بار دو سال کی سزا بھگت رہے تھے ۔سی کلاس اور قیدِ بامشقت تھی۔ بریلی جیل کے تمام سیاسی قیدیوں کی مانگ تھی کہ انھیں اے یا بی کلاس دیا جائے، لیکن مجبوراً سب ہی کو کام کرنا پڑتا تھا۔ رفیع صاحب نے کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ایک دن کمشنر معائنے کو آیا۔ جیلر نے تھوڑی مونج وغیرہ رفیع صاحب کے آگے رکھ دی اور کہا بس یوں ہی ذرا ہاتھ چلاتے رہیے تاکہ وہ سمجھے آپ کام کر رہے ہیں۔ بولے میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جب کام نہیں کرتا تو جھوٹا مظاہرہ کیوں کروں۔ خود بتاتے تھے کہ کمشنر ٹہلتا ہوا اس طرف آیا۔ ان کو پرسکون دیکھ کر بگڑا کہ یہ شخص کام کیوں نہیں کرتا ہے۔ جیلر نے کچھ بات بنانے کی کوشش کی، مگر وہ چھڑی گھماتا ہوا اُن کی طرف لپکا۔ ان کو بھی غصہ آ گیا۔ اس کی چھڑی چھین کر توڑ دی۔ کسی انگریز افسر سے اس گستاخی کی سزا جو ملنا تھی ملی۔ بیڑی ہتھکڑی لگی۔ قیدِ تنہائی ملی۔ اور رفیع صاحب کو بھوک ہڑتال کرنی پڑی۔ مولوی ریاست علی ندوی کے ذریعے جب گھر خبر آئی تو بھائی گئے۔ کئی دن ہلچل رہی۔ آسام کے عبدالمتین چودھری نے سنٹرل اسمبلی میں ایک سابق ممبر کی توہین کا سوال اٹھا دیا۔ وزیٹر مقرر ہوئے۔ ہڑتال ٹوٹی اور رفیع صاحب کو دوسرے ضلع کی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ مجھے یاد ہے دو سال بعد جب گھر آئے تو آتے ہی پینے کو پانی مانگا۔ اور کہا آج چھ ماہ بعد میں نے ٹھنڈا پانی پیا ہے۔ اتنے عرصے برابر چائے پیتا رہا۔ کیوں کہ گورکھپور کے پانی میں گلینڈز کی بیماری ہوتی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد دل کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔
۱۹۳۶ء کے الکشن میں ان کی انتظامی صلاحیتوں اور غیر معمولی قوتِ حافظہ وقوتِ ارادی کا لوگوں کو اندازہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ مخالفین اور اپوزیشن والے بھی ان کی سچائی اور حسنِ انتظام کے قائل تھے۔ کیوں کہ اکثر مشکل مواقع پر انھوں نے

بھی مدد مانگی اور مستفیض ہوئے۔ رفیع صاحب اپنے سیاسی خیالات میں گاندھی جی
سے بہت زیادہ متاثر تھے، مگر طریقِ کار میں کسی حد تک غیر مقلد تھے۔ وہ کبھی آشرم
میں نہیں ٹھہرے۔ سختی کے ساتھ کھدّر پوش رہے، مگر چرخہ نہیں کاتا۔ اپنی وضع
قطع اور طرزِ رہائش میں کسی تقلید کی کوشش نہ کی اور اس دور کی نام نہاد مذہبیت
سے جس میں ہندو گاندھی جی کا نام لے کر اور مسلمان خلافت تحریک کے بہانے سے
رنگ گئے تھے، رفیع صاحب کوسوں دُور رہے۔ اگرچہ جب تک دل کی بیماری
نہیں ہوئی تھی وہ سفر و حضر میں رمضان کے پورے روزے رکھتے تھے، مگر
کہیں ظاہر نہ ہونے دیتے تھے کہ روزہ دار ہیں، سوا اس کے جہاں افطار کرتے۔
ہندستان کے کسی حصّے میں بھی ہوتے، رمضان کے آخری تین دن مسولی میں
مست دلی شاہ کی مسجد میں تراویح سننے آجاتے اور عید کی نماز پڑھ کر غائب ہوجاتے۔
لیکن کبھی امداد اور داد و دہش میں ذات پات، مذہب، غریبی امیری کو دخل نہ
ہونے دیا تھا۔

اسی طرح گاندھی جی جیل میں قانونی پابندیوں کے قائل تھے۔ مگر رفیع صاحب
صرف اس حد تک جتنا ان کی خودداری یا مصلحت اجازت دیتی۔ خفیہ رسل و
رسائل، مشقت سے انکار، ہر توہین کا خاموش مقابلہ اور اندر رہ کر باہری
حالات سے باخبر رہنا شاید وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ ہمیں مہینوں پتا نہ چلتا
کہ وہ کہاں ہیں۔ جن دنوں روپوش ہوتے، کسی بہت ہی اہم اور ضروری کام میں
مصروف ہوجاتے۔ اس دوران وہ خوب پڑھتے۔ صرف دو ایک مخلص دوست
اس راز سے واقف ہوتے۔ یہی طرح طرح کے لباس ان کے لیے مہیا کرتے تھے
تاکہ وہ بھیس بدل کر پبلک اور ہر محکمے کی کارگزاری کو بچشم خود دیکھ سکیں۔ ایک بار
ایسے ہی کسی موقع پر مسٹر کیشو دیو مالویہ نے اپنی بیوی اور بیٹی سے کہا آج ایک

سیٹھ جی نے دعوت کی ہے۔ تم بھی چلو۔ اور جب گھنٹی بجانے پر سیٹھ جی باہر نکلے تو وہ رفیع صاحب تھے، جنھیں شاید ایک اہم کام مسٹر مالویہ کے سپرد کرنا تھا۔

دوستوں کے وسیع حلقے میں کانگریسی، سوشلسٹ، کمیونسٹ، علما، دانشور، پرچون کی دوکان والے بنیے اور بڑے بڑے کارخانے دار کروڑپتی شامل تھے۔ مگر اصل دوست چند ہی تھے۔ ان میں سے کچھ کی حماقت ان کی تفریح طبع کا باعث تھی، کچھ مخلص مشورہ کار تھے اور چند پرانے کلاس فیلو۔

جب تک زندہ رہے، دوستوں کو ان کی دوستی پر فخر رہا۔ مخالفین کو ان کی سچّائی و انصاف پر بھروسا تھا۔ ضرورت مند ان کی قیافہ شناسی کے اس حد تک قائل تھے کہ بغیر لب ہلائے بھی مشکل حل ہو جائے گی۔ ہم جیسے ان سے عقل و سمجھ مستعار لیتے تھے۔ بچّے سمجھتے تھے دُنیا کی بڑی سے بڑی چیز بھی مانگو تو اُن سے مل جائے گی اور عورتوں کو اپنی تمام سماجی، گھریلو اور سیاسی دشواریوں کا حل ان کے پاس نظر آتا تھا۔

۴۵ء میں ایک بار بھائیوں نے سوال کیا کہ اب تو غالباً آپ لوگ جیل نہ جائیں گے اب کیا کریں گے۔ کہنے لگے اب ہم آپس میں لڑیں گے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اب رجعت پسندوں کی، ترقی پسندی سے سخت مڈبھیڑ ہونے والی ہے۔ کسی نے پوچھا کیا آپ کبھی وزیر بھی ہو سکتے ہیں بولے۔ جو کچھ ہوں گا کانگریس کے اندر ہی رہ کر۔ ایک بار سوال کیا گیا کہ انگریز کیا پاکستان بنا دیں گے۔ کہا ہاں یقیناً بنا دیں گے کیونکہ انھیں ہندستان میں..... بنا نا ہے۔

رفیع صاحب ۴۶ء میں ہارنے کے بعد وزارت قبول کرنا اصولاً غلط سمجھتے تھے۔ صرف یونیورسٹی سیٹ سے وہ کامیاب ہوئے تھے۔ لیکن جواہر لال جی بضد تھے۔ نینی تال میں اس سوال پر دونوں میں بحث ہو رہی تھی۔ رفیع صاحب نے

کہا آپ کہا کرتے ہیں کہ میرا دماغ بہت چلتا ہے۔ پنڈت جی ہنسے۔ کہنے لگے، ہاں کہتا ہوں۔ اور یہ بھی مانتے ہیں کہ اکثر آپ سے زیادہ تیز چلتا ہے۔ جواہر لال جی نے کہا، یہ بھی مانتا ہوں۔ ہنس کر کہا تو پھر سمجھ لیجیے اس وقت بھی آپ سے زیادہ تیز چل رہا ہے۔ مگر بات مذاق میں ختم نہ ہو سکی اور رفیع صاحب کو مجبوراً پارٹی کے حکم سے یو۔پی وزارت میں شامل ہو کر زبردست طعن تشنیع اور اہانت برداشت کرنا پڑی، جس کا نشانہ لیگی ممبران نے ان کو اس وقت تک بنائے رکھا جب تک کہ ان کو ہندستان سے بھاگنے میں رفیع صاحب کی مدد کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ تقسیم کے خلاف تھے۔ خاتمۂ زمینداری کے بانی تھے۔ سوشلسٹ نظامِ حکومت کے لیے کوشاں تھے اور صورتِ حال سے غیر مطمئن۔ اس لیے انھیں اپنے سینیر ساتھیوں اور حکومت کے ذمّے داروں سے بھی ٹکر لینا پڑی۔ وزارت سے استعفا بھی دیا۔ اور عین کامیابی کے وقت جب ان کا وعدہ انھیں یاد دلایا گیا، تو بڑھا ہوا قدم پیچھے ہٹا لیا۔ لوگوں نے کہا خودکشی کر لی۔ مگر یہ خودکشی بحیثیت فوڈ منسٹر ان کے اخلاص، تدبیر، انصاف اور ایمان داری کی بدولت ان کو زندۂ جاوید کر گئی۔

طالبِ علموں کے لیے ہمیشہ ان کے دل میں نرم گوشہ رہا اور جب انھیں محسوس ہوا کہ کام بہت ہے اور وقت کم، تو اپنے دن کی ابتدا ۴ بجے رات سے کر دی۔ ان کی خود اعتمادی کے پردے میں خدا پر بھروسا ہمیشہ کارفرما رہا۔
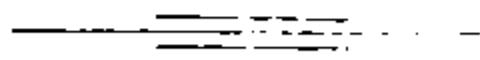
خوفِ غمّاز عدالت کا خطر دار کا ڈر کیا ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور بھی

یہ تھے مولانا محمد علی - بے چین، بلا کے ذہین، بے نظیر مقرر، مشہور صحافی ہوتے ہوئے قرونِ وسطیٰ کے مجاہدین اسلام کی تمام خصوصیات کا مجموعہ اور "بے خطر آتشِ نمرود" میں کود پڑنے والے جذبۂ عشق سے معمور - سود و زیاں سے لاپروا ہو کر سچ بولنے کی ہمت و طاقت رکھنے والے محمد علی جن کی موت پر ایچ - جی ویلز نے کہا تھا "محمد علی کا قلم میکالے کا قلم تھا، ان کی زبان برک کی زبان تھی اور ان کا دل نپولین کا دل تھا" لیکن میں ان کے بارے میں جانتی ہی کتنا ہوں - صرف اتنا کہ وہ میرے والد کے مخلص دوست تھے اور میری اوائل عمری میں مسلمانوں کے مقبول ترین لیڈر تھے - جب ہوش سنبھالا تو ہندوستان میں علی برادران کا طوطی بول رہا تھا اور وہ گاندھی جی کے دستِ راست بڑے بھائی تھے -

ان کی تقریریں، تحریریں، خطبات، کراچی کے مقدمے میں ان کی معرکۃ الآرا بحث، موتمر اسلامی میں شاہ ابنِ سعود کے سامنے اعلائے کلمۃ الحق اور گول میز کانفرنس لندن میں آخری زندہ جاوید الفاظ نے عقیدت و احترام کے جو جذبات پیدا کر دیے تھے، آج بھی یاد کرتی ہوں تو خون میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے -

بحیثیت مسٹر محمد علی کے زندگی کی ابتدا انھوں نے رام پور کے قیام، آکسفورڈ

کی تعلیم، بڑودہ میں ملازمت، کامریڈ کی ایڈیٹری اور مہاراجا محمود آباد کی دوستی سے کی۔ شاعر ہوتے ہوئے بھی وہ مدح وستایش کے خوگر نہ بن سکے۔ ملک کے صفِ اوّل کے لیڈر بن کر بھی وہ "وبائے عام" کا شکار نہ ہوئے۔ صحافت میں سچائی و بے باکی کی بنیاد ڈالی اور سیاست کے اکھاڑے میں بھی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ افلاس کے باوجود کسی کے سامنے گردن نہ جھکائی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے مسلمان ہونے اور مسلمان کہنے پر انھیں کبھی شرم نہ آئی، بلکہ فخر رہا اور وطن پرستی بھی ان کا جزوِ ایمانی رہی۔

میں نے پہلی بار انھیں ۱۹۱۴ء میں اُس روز دیکھا تھا جب بارہ بنکی میں ہمارے گھر پر ضلع کی تمام قابلِ ذکر ہستیاں جمع ہو کر "انجمن خدّامِ کعبہ" کی بنیاد ڈال رہی تھیں۔ میرے والد انتہائی مصروف تھے۔ بچّوں کو اس مجمع میں گھُسنے کی اجازت نہ تھی، کیوں کہ وہاں زوردار بحث ومباحثہ جاری تھا۔ لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح انھیں دیکھ ہی لیا۔ سُرخ و سپید رنگ، اونچا قد، فربہی کی طرف مائل جسم، سیاہ کلیباک ٹوپی پر ہلال اور شیروانی پر "خادمِ کعبہ" کا بیج لگائے ہوئے۔ کیا بتاؤں وہ کتنے اچھے اور شاندار لگ رہے تھے، اور تب ایک بیج مانگ کر میں نے اپنی اوڑھنی پر ٹانک لیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ کا مردِ بیمار یعنی خلافتِ ترکیہ آخری سانس لے رہی تھی۔ کبھی جنگِ بلقان اور کبھی رومانیہ و بلغاریہ کی بغاوت اور اب جنگِ عظیم میں ترکی کی شمولیت نے مسلمانوں میں ہلچل پیدا کر رکھی تھی۔ ہر گھر میں انور بے کی تصویر آویزاں تھیں اور میرے گھر ایک جلاوطن ترک بہ نفسِ نفیس مقیم تھا۔

کچھ ہی عرصے بعد دار و گیر کی خبریں آنے لگیں۔ کامریڈ بند ہوا۔ علی برادران چھندواڑہ میں نظر بند ہو گئے۔ حسرت موہانی نے قید بامشقت میں منوں آٹا پیس ڈالا۔ مولانا محمود حسن اور حضرت مدنی مالٹا میں اسیر ہو گئے۔ علی احمد صدیقی اور بہت سے نوجوان عمر قید کی سزا بھگتنے کالے پانی سدھارے اور میرے والد کی مصروفیات وکالت سے

زیادہ سیاسی ہوگئیں۔ اس لیے سی آئی ڈی والوں نے ستانا شروع کردیا، لیکن میں اس وقت ہوش وخرد سے اتنی بے گانہ تھی کہ سب گھر والوں سے سُنی سُنائی کہہ رہی ہوں۔

غالباً ۱۷ء میں میرے والد نے بہت کوشش کے بعد چھندواڑہ دوست سے ملنے جانے کی اجازت حاصل کرلی اور کئی روز ان کے پاس مقیم رہے۔

انھیں دنوں حکومتِ برطانیہ نے معافی نامے پر دستخط لے کر دونوں بھائیوں کو رہا کردینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس سلسلے میں حکومت کا ایک نمائندہ ضروری شرائط لے کر ان دونوں سے ملا۔ مسلسل تنہائی و نظر بندی نے شوکت علی کو شاید کچھ تھکا دیا تھا۔ اس لیے وہ مذبذب تھے لیکن محمد علی بدستور اس سے الجھ رہے تھے۔ اسی کش مکش کے دوران بی اماں کمرے میں داخل ہوئیں اور انھوں نے دو ٹوک فیصلہ کردیا کہ تم دونوں سُن لو، اگر تم نے معافی نامے پر دستخط کیے تو میں اپنے انھیں کمزور ہاتھوں سے تمھارا گلا گھونٹ دوں گی۔ شیر دل ماں کے الفاظ نے محمد علی کی رُوح خوش کردی اور آفیسر بے نیل مرام واپس ہوا۔

جنگ ختم ہوئی۔ قیدی رہا ہوئے تو محمد علی کے قلم و زبان نے پھر جوش وخروش کے دریا بہانے شروع کردیے۔ ان کے جوش خطابت اور دلیرانہ طرزِ نگارش نے نوجوانوں میں ایسا جوش وخروش پیدا کردیا تھا کہ اب اسے دبانا حکومت کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اتحاد اور ۱۹۱۹ء کی سول نافرمانی تحریک نے بغاوت کی رُوح پھونک دی اور اسی سال میں نے دوسری بار پھر دونوں بھائیوں کو اپنے گھر میں دیکھا۔ نظر بندی سے رہا ہو کر وہ مولانا عبدالباری صاحب سے ملنے فرنگی محل لکھنؤ آئے اور میرے والد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے ہمارے گانو مسولی تشریف لائے۔ اس چھوٹے سے گانو میں تب پکی سڑک بھی

نہ تھی۔ مین روڈ سے گانو تک انھیں لانے کے لیے رفیع بھائی نے کہار اور فینس بھجوائے۔ ضلع بھر کے مشتاقانِ دیدار اس گانو میں جمع تھے۔ محمد علی کا فینس تو ٹھکانے سے پہنچ گیا، لیکن مولانا شوکت علی جو ویسے ہی لیم وشحیم تھے، نظربندی کے دوران کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا، ان کی پالکی آٹھ کہاروں کے کاندھے سے ہوتی ہوتی چرچرا کر نیچے بیٹھ گئی۔ ناچار دوسرا فینس اور تازہ دم کہار گئے اور کچھ دیر کے بعد شوکت علی مسولی کے کہاروں کی مضبوطی وجواں مردی کی تعریف کرتے ہوئے تشریف لائے ——— محمد علی نے استقبال کرنے والوں کے ہجوم میں اپنے پرانے کلاس فیلو اور میرے چچا نواب علی صاحب کو ان کے چھوٹے قد اور دبلے پتلے جسم کے باوجود تلاش کر لیا اور فرطِ محبت سے ان کا بوڑھا منھ چوم لیا۔ زمانۂ قید میں جو اشعار کہے تھے وہ ان کو سنائے۔ قبرستان جاکر آنسو بہائے۔ مجھے صرف ایک شعر یاد رہ گیا ؎

آئی ہوئی رضائے الٰہی کی ہے برات
سب کربلا میں جمع ہیں مہمان اولیا

رفیع بھائی اُن دنوں طالب علم تھے مگر ایک بچّے کے باپ بن چکے تھے، اسے گود میں لے کر انھوں نے کہا باپ ہی کے ایسے گھاگ لگتے ہو۔ ذرا دیکھیے تذکرہ ہے ایک قومی لیڈر کا، ذی علم انسان کا، بے مثل صحافی کا اور میں یہ گھریلو ٹائپ کی باتیں سنا رہی ہوں۔ لیکن معاف کیجیے، میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں، میں اُن کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ ان کی نجی زندگی کے بارے میں اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ انتہائی خوش گوار تھی۔ بیوی اور لڑکیوں کے چہرے سے مسرت پھوٹی پڑتی تھی اور متوسّط درجے کے لوگوں کی طرزِ رہائش میں جتنی خوبیاں اور خوشیاں ہوسکتی ہیں، وہ سب موجود تھیں۔

مولانا محمد علی پھر گرفتار ہوئے۔ وہ اب مولانا کا خطاب بلکہ فضیلت کی پگڑی اپنے

مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے حاصل کر چکے تھے۔ اس قید و بند میں ان کے رفیق مولانا حسین احمد مدنی، مولوی ثناء اللہ امرتسری وغیرہ پانچ افراد تھے۔ اس مقدمے میں مقدمے کی پیروی محمد علی نے خود کی اور اس ٹھاٹھ سے کی کہ پھانسی اور عمر قید کے بجائے صرف دو سال کی سزا دے کر عدالت نے اس بھڑوں کے چھتے سے چھٹکارا حاصل کیا۔

لیکن یہ دو سال عربی داں علما کی صحبت میں مولانا محمد علی نے عربی سیکھنے میں گزارے اور غیر معمولی استعداد بہم پہنچالی۔ اسی قید میں ایک بار سخت بیمار ہوئے پیچش کا شدید حملہ ہوا اور تمام رات کی دوا دوش کو دیکھ کر حکام جیل نے ایک کموڈ کا انتظام کر دیا۔ لیکن طرفہ تماشا یہ تھا کہ رات میں جتنی بار جاتے کموڈ صاف ستھرا ملتا۔ حیران ہوتے مگر نقاہت کے مارے آنکھ بند کر کے پڑ رہتے۔ آخری بار ارادہ کر لیا کہ جو کچھ ہو اس صاحب ہمّت کو گرفتار ضرور کریں گے۔ اس لیے کمزوری کے باوجود چوکنّا رہے۔ ذرا دیر بعد دیکھا کہ ایک صاحب اپنے ہی ساتھیوں میں سے چپ چاپ اُٹھے، بہ آہستگی برتن نکالا اور پانی کی سمت چلے۔ محمد علی نے فوراً بستر سے کود کر ہاتھ تھام لیا اور چلّائے میں نے چور پکڑ لیا۔ ساتھیوں نے نیند سے چونک کر دیکھا تو حضرت مولانا مدنی شرمندہ کھڑے آہستہ آہستہ ان کو منع کر رہے تھے کہ شور نہ مچاؤ۔ اور محمد علی نے ہاتھ تھام رکھا تھا۔

سو بھئی ایسے ہوا کرتے تھے اُن دنوں سیاسی رفقائے کار۔

میں پہلے ذکر کر چکی ہوں کہ انھوں نے عربی ان علمائے کرام سے جیل میں پڑھی تھی۔ یہ عربی دانی اُس وقت کام آگئی جب ۱۹۲۶ء میں شاہ ابن سعود نے مکہ معظمہ میں مؤتمر اسلامی بلائی — اور شرکت کے لیے مکّہ گئے تو بے تکلف تقریر کرنے کھڑے ہو گئے معلوم نہیں اس تقریر کا کوئی ریکارڈ موجود ہے یا نہیں مجھے تو ساری تفصیل

ان عینی مشاہدین سے ملی جو حج کے ارادے سے مولانا عابد حسین کی سرکردگی میں قافلۂ حج کے افراد تھے۔ ان میں کئی میرے خاص اعزہ ماموں چچا دادا وغیرہ بھی تھے۔ انھیں دنوں کا شعر ہے ؎

دیں اور کو حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت چاہتا ہوں زمینِ حجاز میں

سُنتی ہوں، مولانا محمد علی نے خلافت و بادشاہت کے فرق اور اسلام کے نظریۂ شوریٰ پر برجستہ تقریر کی اور شاہ ابن سعود نے اس پر بہت ہی ناگواری کا اظہار کیا۔ شاید خلافتِ ترکیہ کے خاتمے کے بعد شاہ کا مقصد تھا کہ موتمر کے ذریعے دنیائے اسلام کی سربراہی اور امیر المومنین کا تمغۂ امتیاز بھی بہ اتفاق رائے ان کو حاصل ہو جائے کیوں کہ حکومت و طاقت جو لازمۂ خلافت ہے اب ان کی طرف منتقل ہو چکی ہے۔ محمد علی کی تقریر نے علمائے اسلام کو غور کرنے پر مجبور کر دیا۔ مفتی فلسطین امین الحسینی اور راشد علی گیلانی نے عربی زبان کی کمزوریوں کے باوجود اس جرأت مندانہ اظہارِ حق کا خیر مقدم کیا۔ غرض محمد علی شاہ کے تحت الشعور میں چھپی ہوئی تجویز کی ناکامی کا باعث بن گئے۔ اور ایسے معتوب ہوئے کہ شاہی مہمان بھی نہ رہے۔ ناچار بارہ بنکی والے قافلے میں شامل ہو کر حج و زیارت کے ارکان ادا کیے۔ واپس آنے والوں نے بتایا، محمد علی بقیع کے کھنڈرات اور ابن سعود کے شوقِ بربادی و مسماری پر آنسو بہاتے تھے اور وہاں کے حالات سے سخت برہم و بددل تھے۔

میں نے پھر مولانا محمد علی کو ۱۹۲۸ء میں اُس روز دیکھا جب نہرو رپورٹ کی تیاری کے سلسلے میں مذاکرات ہو رہے تھے۔ موافق و مخالف تمام لیڈران رفیع بھائی کے گھر ڈنر پر مدعو تھے۔ اس مجمع میں موتی لال نہرو، بہار کے مولوی شفیع داؤدی، مدراس کے سید مرتضیٰ، شان مکھم چیٹی، راما سوامی آئنگر، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی

سب ہی موجود تھے ۔ ان دنوں ان کی صحت کافی خراب ہو چکی تھی ، لیکن جولانیٔ طبع میں کوئی فرق نہ آیا تھا ۔ ڈنر سے بہت پہلے آ گئے تھے اور ہنسی مذاق ، لطائف و ظرائف میں وقت گزارا ۔ وہی چار روز پہلے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں چند کانگریسی نوجوان کچھ گڑبڑ بھی مچا چکے تھے اور مولانا شوکت علی اس پر برہم تھے ، اختلافات کی ابتدا ہو چکی تھی ، جو بڑھتی گئی ۔

ان کی دو کمزوریاں تھیں ۔ دسترخوان پر لذیذ غذا دیکھ کر اپنے کو روک نہ پاتے تھے ، چاہے اس سے کتنا ہی نقصان پہنچ جائے اور دماغ میں بہترین جملہ آ جائے تو کہے بغیر نہ رہ سکتے تھے خواہ اس کے اثرات کتنے ہی دوررس کیوں نہ ہوں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کمزوری نے ان کی صحت کا ستیاناس کیا اور دوسری نے ان کی قابلیت اور سیاست کو تدبر سے محروم کر دیا ۔ مولانا محمد علی کو ، ان کی جدوجہد کو جس طرح بھلانے کی کوشش کی گئی ، وہ بھی اپنی جگہ ایک شرمناک داستان ہے ۔

کانگریس میں ۱۹۲۶ء تک ان کا بول بالا رہا ۔ مہاسبھا اور مسلم لیگ کی سرگرمیوں نے ہندو مسلم مناقشات کو ہوا دی اور مولانا کا قلم بالکل شعلہ فشاں بن گیا ۔ وہ اپنے پرائے سب کے خلاف نبرد آزما ہو گئے حتیٰ کہ اپنے مرشد تک سے بھڑ گئے ۔ ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگانے والے بھی ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکے ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آزادیٔ کامل کے شیدائی نے اگر ڈومینین اسٹیٹس پر قناعت کرنے کو احساسِ کمتری یا کمزوری سمجھا تو اس میں بدگمانی اور بدنیتی کا شبہ کیسے پیدا ہوا ۔ آخر جواہر لال جی بھی تو نہرو رپورٹ سے کافی اختلاف رکھتے تھے ۔

بہرحال یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر ہندوستان کا مورخ ہی بحث کر سکتا ہے ۔ یہ میری دسترس سے باہر ہے ۔ رسالہ آج کل کے محمد علی نمبر میں جو تاریخ وار حوالے دیے گئے ہیں ان میں ہمدرد بند ہونے کا ذکر ۲۶ء کے اوائل میں ہے ، لیکن یہ غلط

ہے۔ میں نے ۱۹۲۸ء میں ہمدرد پڑھا ہے اور ان دنوں یہاں سنٹرل اسمبلی کا سیشن ہو رہا تھا۔

۱۹۲۶ء میں علی برادران بہ ارادۂ حج و شرکت موتمر اسلامی مکہ معظمہ و مدینہ منورہ گئے تھے جس کا میں پہلے ذکر کر چکی ہوں اور ہمارے خاندان کے بیشتر افراد جس میں ان کے دوست نواب علی صاحب وکیل اور بیگم رفیع احمد قدوائی بھی ہم سفر تھیں۔

۲۸ء میں مجھے ان کے خاندان سے قربت کا بھی موقع ملا۔ ان کا گھر متوسط طبقے کا سادہ سا گھر تھا اور طرز رہائش میں دولت و تعیش کا کوئی دخل نہ تھا۔ بیوی پوری زوردار پٹھانی تھیں۔ مرعوب ہونا اور دبنا تو جانتی ہی نہ تھیں، مگر اتنا شدید عشق دونوں کو ایک دوسرے سے تھا کہ شاید زندگی میں کسی معمولی رد و کد کی نوبت بھی نہ آئی۔ ان کی خوش اخلاقی اور والد مرحوم کے تعلق کی وجہ سے مجھ گمنام ہستی کو اس دور کی تمام مشہور خواتین، مصنفین اور لیڈیز کانفرنس کی ممبروں سے ملنے کا موقع نصیب ہوا۔

علی برادران لکھ کر نام تو دونوں بھائیوں کے ساتھ لیے جاتے ہیں، لیکن جہاں تک میرا اندازہ ہے، شاہ ابن سعود سے مایوس ہونے کے بعد محمد علی کو خلافت تحریک و کانفرنس سے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی تھی۔ یہ تو مولانا شوکت علی تھے جو اسے برسوں سنبھالے بیٹھے رہے۔ کیوں؟ یہ امر غور طلب ہے شوکت علی دس بارہ سال بڑے ہونے کی وجہ سے اپنی رائے کو صائب اور اپنے مشورے کو اس حد تک ضروری سمجھتے تھے کہ اکثر ڈانٹ ڈپٹ کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ ویسے مزاج کے لحاظ سے بھی دونوں میں فرق تھا۔ شوکت علی آرام طلب اور سیاسی سوجھ بوجھ میں ہرگز محمد علی کے ہم پلہ نہ تھے۔ محمد علی کی مجاہدانہ اسپرٹ، دولت سے بے نیازی اور بہت سی چیزیں ایسی تھیں جن پر وہ اپنی بزرگی کا سایہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ ایک المناک حقیقت تھی۔

۱۹۴۶ء میں بیگم محمد علی کو لیگ کے ٹکٹ پر انھیں کے مشورے سے الکشن لڑنا پڑا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کانگریس نے اُن کے خلاف کسی امیدوار کو ٹکٹ نہ دے کر ان کی عزت و احترام کو قائم رکھ لیا۔ بلکہ مجھے یاد ہے، ان کے الکشن میں مخالف گروپ بھی جا کر پہلے اُن سے سلام و دُعا کر لیتے تھے پھر ایک دوسری پارٹی پر آگ برساتے تھے۔

پبلک زندگی میں کون ایسا ہے جسے عروج و زوال، مقبولیت و نامقبولیت سے واسطہ نہیں پڑتا اور پھر لیڈر، اس کا تو یہ حال ہوتا ہے

گفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظۂ غافل بودم و صد سالہ منزل دُور شد

اسے بدگمانیوں کا شکار بھی ہونا پڑتا ہے۔ الزامات کی فہرست بھی تیار ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر مسلمان لیڈروں کو اس احمقانہ سوال کا جواب بھی دینا پڑتا ہے "پہلے ہندستانی ہو یا پہلے مسلمان"۔ محمد علی کو بھی ان سب سے سابقہ پڑا۔ اگر زندگی وفا کرتی تو یقیناً وہ پھر صفِ اوّل کے لیڈر ہوتے کیوں کہ ان دنوں بھی اُن کی تحریریں و تقریریں سب کے لیے سُرمۂ بصیرت تھیں اور نوجوانوں کے لیے مہمیز۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آزاد ہندستان میں ان کا ٹھکانا جیل ہوتا یا تختۂ دار۔ کیونکہ مردانِ حق کو دُنیا سے اکثر یہی انعام ملا ہے۔

مولانا شاعر بھی تھے، لیکن شاعری ان کی ہابی تھی، عزّت و شہرت کا ذریعہ نہیں۔ اگر سیاست کے اُلجھادے میں نہ پھنسے ہوتے تو یقیناً شاعر، ادیب، مصنف، مورّخ سب کچھ بن جاتے۔ سارے جراثیم اُن کے اندر موجود تھے۔

مولانا محمد علی تین ریاستوں رام پور، بڑودہ اور بھوپال سے ابتدائی تعلق اور مہاراجا محمود آباد سے آخر دم تک گہری دوستی کے باوجود اپنے کردار کی پاک بازی

اور امجدی بیگم سے عشق کے لیے احباب میں ضرب المثل تھے۔ ارباب سیاست کو اکثر چیلنج ملتے ہیں، لیکن محمد علی کو لکھنؤ کی ایک حسین مشہور طوائف کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ قتالۂ عالم دعوے دار تھی کہ پاک بازی کی تیلیاں منٹوں میں بکھر سکتی ہے۔ ازرِ تقدس کے بوریے پر بھی محفلِ نشاط آراستہ ہو سکتی ہے۔ شرط بھی کس سے ہوئی مہاراجا محمود آباد سے، جو محمد علی کے کردار کی مضبوطی و پاکی کے اس حد تک قائل تھے کہ

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

لیکن وہ شرط ہار گئی اور بری طرح ہاری کہ جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ محمد علی چھڑے چھٹانک نہیں، دو بچوں کے باپ اور ایک بیوی کے شوہر ہیں تو اُس نے اپنا سر پیٹ لیا کہ کتنے دھوکے باز ہیں، اُلٹے مجھ سے معافی منگوالی۔ اور آج برسوں بعد مولانا محمد علی پھر ہندستان کو یاد آتے ہیں۔ انھیں اپنے وطن سے عشق تھا۔ وہ لندن سے لوٹے یا نہیں، اُن کے بول، اُن کی آواز، اُن کا جذبۂ عشق، اُن کے سینے میں دبی ہوئی آگ کی چنگاریاں ہمیشہ سرفروشانِ وطن و انسانیت کو گرمی پہنچاتی رہیں گی ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے\
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے

۴۔ شفیق الرّحمان قدوائی

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

شاعر نے تو زندگی کی حقیقت چند لفظوں میں بیان کر دی، لیکن ان اجزائے پریشاں کے ساتھ کاش ہمارے روحانی تعلقات، رشتے، امیدیں، آرزوئیں، حال اور مستقبل کی بے شمار بربادیاں وابستہ نہ ہوتیں تو شاید ہم سب شفیق بھائی کی موت پر ایک فلسفیانہ نظر ڈال کر ان کی یاد کو بھی آسانی سے جدا کر سکتے۔

لیکن ہم ایسا نہ کر سکیں گے۔ سال ہا سال تک پبلک پلیٹ فارم، جامعہ ملیہ اور گھر کے صحن تک جب بھی کوئی موقع ہوگا، اس قافلے کے تمام رہرو جب کبھی اکٹھے ہوں گے، جس کے وہ میر کارواں تھے: جب تک جامعہ کا وجود قائم رہے گا اور تعلیمی ترقی کے لیے طریق کار منتخب کیا جائے گا، ان کی جگہ ہمیں خالی نظر آئے گی ان کے نقشِ قدم ڈھونڈنے کو جی چاہے گا اور ان کی یاد سے آنکھیں اشک بار ہو جایا کریں گی۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء سے لے کر مارچ ۱۹۵۳ء تک مجھے بھی اُن کے شاگردوں، ساتھیوں اور ہم سفروں میں شامل رہنے کا فخر حاصل تھا اور ان چند برسوں میں اتنے قریب سے انھیں دیکھنے کا موقع ملا، جو اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔

ان چند برسوں میں اُن کی عظمت و تقدیس کا واضح تصوّر اور ہمت و استقلال،

سادگی و پُرکاری اور بے خودی و ہشیاری کے اتنے روشن ثبوت نظر سے گزرے کہ بے ساختہ سرِ عقیدت سے جھک گیا۔ حسن کی اصطلاح میں عشق اسی کا نام ہے۔
ویسے تو لوگ اس وقت بھی ان کے ایثار و خلوص کے قائل تھے، جب خاندان کے بزرگ ان کو 'گمراہی' سے بچانے کی سرتوڑ کوشش میں مصروف تھے اور ان کا شمار ان دنوں ناخلف اولادوں میں ہو چکا تھا، جب وہ معذرت کے لمبے لمبے خط اپنے والد کو لکھا کرتے تھے مگر جس راستے پر قدم رکھ دیا تھا اس سے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ کم از کم میں نے ہمیشہ ان کو اتنا ہی بلند سمجھا تھا، قریب پہنچ کر کچھ اور قدآور نظر آئے۔

ان کی نالائقی اور بے وقوفی پر کفِ افسوس ملنے والے بھی اب اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ کر داعیِ اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں، لیکن مرنے سے پہلے وہ بھی ان کی مستقل مزاجی اور خلوصِ نیّت سے مرعوب ہو کر ان کو ان کے حال پر چھوڑ چکے تھے۔
سختیوں اور اختلافات کے جواب میں شفیق بھائی کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے، لیکن راہِ عمل سے منہ بھی نہ موڑا، نہ مسکراہٹ میں تلخی پیدا ہوئی۔ بدستور ہنستے مسکراتے بزرگوں سے معافی مانگتے ہوئے، اپنا راستہ چلتے رہے۔ عیش و آرام کی زندگی کو تج کر فقر و فاقہ کو اپنا لینا اور زندگی کی تلخیوں کو مسکرا کر سمیٹ لینا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ مخالفتوں نے ان میں غضب کی خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ نہ وہ کسی سے توقع رکھتے تھے، نہ کسی سے مدد قبول کرتے تھے۔ نہ کسی سے امید تھی، نہ کسی کا گلہ نہ کسی بات پر افسوس۔

۱۹۴۷ء کے وہ چند دن بھی اعزّہ اور احباب پر بہت ہی سخت گزرے تھے جب دوستوں اور پڑوسیوں کے ساتھ وہ قرول باغ کے ایک مکان میں محصور زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھے۔ ان کو وہاں سے نکالنے کی کوششیں ناکام

ہورہی تھیں، کیونکہ وہ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر ہٹنا نہ چاہتے تھے۔

آخر کار ان سب کو محفوظ مقامات پر پہنچانے کے بعد وہ تن تنہا اس مکان میں ملے اور اس حال میں رفیع بھائی کے گھر ۶ کنگ ایڈورڈ روڈ (موجودہ مولانا آزاد روڈ) پر لائے گئے کہ بس "صورت ببیں حالم مپرس"، معلوم ہوا کہ اس گروہ کے کچھ لوگ تو جان بچانے کی کوشش میں از خود بھی نکل گئے اور کچھ کو وحشت و بربریت کی چیرہ دستیوں نے موت کی نیند سلا دیا۔ بنگال کا آتش نوا شاعر نذر السلام کہتا ہے

آگ میں جل یا دریا میں تیر
دونوں میں کوئی فرق نہیں
اگر زندوں کی طرح جینا ہے تو
سر پہ طوفانوں کا سایہ رہنے دے
اور دریائے موت کو قدموں کے نیچے بہنے دے

شاید زندوں کی طرح جینے کی جدّوجہد میں جان بچانے کی کوشش ان کو موت نظر آتی تھی۔ بہر حال یہاں آکر وہ پناہ گزینوں کے اس انبوہ میں شامل ہو گئے جو شہر اور مختلف مقامات سے آ آکر یہاں اکٹھے ہو رہے تھے۔ ان میں افسر بھی تھے، رؤسا بھی، دلّی کے قدیم خاندان بھی تھے اور غریب عوام اور پردیسی بھی۔

مگر شفیق بھائی کی شخصیت ان سب سے الگ نظر آتی تھی، انھیں نہ مال و اسباب کا غم تھا، نہ پاکستان جانے کی فکر۔ نہ وہ ہندؤں کو گالیاں دیتے تھے، نہ مسلمانوں میں شامل ہو کر نوحہ خوانی کرتے تھے۔

ہاں ان کے دل پر ملک کی تباہی کی، جامعہ کے مرکز کی تباہی کی اور انسان کے تنزّل کی چوٹ تھی ـــــ فکر تھی تو جامعہ ملیہ اور اہل جامعہ ملیہ کی۔ اور کام تھا مصیبت زدوں کی مدد ـــــ اس مجمع میں وہ ایک تماشائی کی طرح ان بپھرے ہوئے

نوجوانوں کی حالت دیکھ کر مسکراتے، جو زیادہ سے زیادہ وقت ریڈیو اور تاش کے پتّوں سے دل بہلانے پر صرف کرتے اور باقی وقت روانگی کی تدبیروں اور کانگریس گورنمنٹ کو کوسنے پر صرف کرتے تھے۔

ان دنوں ان کے پاس صرف وہی ایک جوڑا کپڑا تھا، جو اُن کے جسم پر تھا، اور نہ جانے کس وقت اس کو اپنے ہاتھ سے دھو کر صاف کر لیا کرتے تھے۔ اور بڑے آرام سے فرش پر سو جاتے تھے۔ دوسروں کے اصرار پر کہہ دیتے کہ مجھے زمین پر آرام ملتا ہے۔

لیکن جب بڑاگاؤں (بارہ بنکی) سے ان کے لیے بستر اور کپڑے اور دوسری ضروری چیزیں آ گئیں تو ان کو بھی اسی سادگی سے انھوں نے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہ پہلے کوئی دقّت تھی، نہ اب کوئی سہولت ہے۔ راضی بہ رضا رہنے کا یہ عجیب انداز بڑا متاثر کن تھا۔

گھر سے سامان آ جانے کے بعد انھوں نے بہت جلد یہ گھر چھوڑ دیا اور شہر کے کسی حصّے میں منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں شفیق صاحب پیدل گلیوں کے چکر لگاتے دیکھے جاتے تھے۔ اور اس طوفان کا کوئی اثر ان کی دل جمعی، مسکراہٹ اور گفتگو میں نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے غم، غصّہ، نفرت کا زہر شیو کی طرح انھوں نے خود ہی پی لیا تھا۔ اس دوران میں اکثر ان سے ہمایوں کے مقبرے، پرانے قلعے یا شہر کے کسی حصّے میں ملاقات ہو جاتی۔ میں مایوس ہو کر کہتی شفیق بھائی اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ بھلائی کی امید بے کار ہے۔ سب کچھ اور ہر اچھی چیز تباہ ہو گئی۔ میری ہمت ٹوٹ رہی ہے۔ دل چاہتا ہے سب چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ اس کے جواب میں ہمیشہ پشت پر ایک شفقت بھری تھپکی دے کر کہتے "بہن اتنی ناامید نہ ہو۔ کوشش کرتی رہو۔ یہ طوفان گزرنے دو، سب پھر ٹھیک ہو جائے گا۔" ایسے وقت میں نئے عزائم اور امیدوں

سے بھرپور ان کی مسکراہٹ ہم سب کے لیے چراغ راہ کا کام کرجاتی تھی ۔ ایسے حالات میں بھی وہ مستقبل سے مایوس نہ تھے ۔ انتہائی رقیق القلب ہونے کے باوجود ہمت و استقلال نے درویشانہ استقامت پیدا کر دی تھی ۔

وہ اصلیت کو چھپانا اور حقیقت کو جھٹلانا بھی پسند نہ کرتے تھے ۔ راستے کی رکاوٹیں اور مشکلات پر قابو پانے کا ایک ہی گر اُن کے پاس تھا ، یعنی ایک خوش گوار مستقبل کی تعمیر کے لیے کوشش ۔ یہی زندگی ہے اور یہی مقصدِ حیات ہے

جستجو ہے زندگی ذوقِ طلب ہے زندگی
زندگی کا راز لیکن دوریٔ منزل میں ہے

بیسیوں بار میرے سوچنے کا ڈھنگ بدلا ۔ میرے ساتھیوں میں تھکن کے آثار نمودار ہوئے ، تعصب کی تیز و تند آندھی میں ہمیں اپنی چادر بھی اُڑتی نظر آئی ۔ ہم نے بھی مظلوم کے نہیں ہندو اور مسلمان کے بارے میں الگ الگ سوچا ۔ مگر شفیق بھائی نے جب سوچا انسان اور اس کی مصیبت کو سوچا ۔ جب کوشش کی ہندستان اور ہندستانیوں کے لیے کی ۔ جب فکر ہوئی تو دیش کے بچوں اور بڑوں کی جہالت دور کرنے کی اور ان کی تعلیم و ترقی ہی کی فکر ہوئی ۔

بہت جلد سارے اجزائے منتشر کو سمیٹ کر انھوں نے مٹیا محل میں اکٹھا کر لیا اور لوگوں نے تعجب و حیرت کے ساتھ اس بچی کھچی پونجی کو اسی پرانے جوش اور انہماک کے ساتھ سنوارتے اور بناتے دیکھا ، جیسے وہ ۴۷ء سے پہلے کیا کرتے تھے ۔ بغیر غصہ و کدورت اور تعصب کے انتہائی سکون و اطمینان کے ساتھ وہ نئی اسکیم اور نئے عزائم لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ۔

بچوں کی برادری ، بالک ماتا سنٹر میں عورتوں کے اجتماعات ، نوجوانوں کی دل چسپیاں ، اسکول کی رپورٹ جب انھیں سنائی جاتی تو مسرت قابلِ دید ہوتی تھی ۔

سب کچھ ان کے دماغ کی پیداوار اور ہمت افزائی کا نتیجہ ہوتا۔ مگر وہ کبھی یہ نہ کہتے ہمیشہ اس طرح ذکر کرتے تھے، کہ بھئی ہمارا فلاں لڑکا بہت ہی اچھا نکلا۔ اس بےچارے نے دیکھو اتنی مشکلوں کے باوجود یہ کچھ کرڈالا۔ یا ہمارے جامعہ کے یہ نوجوان ایسے نکلے ہیں کہ جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اُسے کرکے چھوڑتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

مجھ سے اکثر کہا کرتے، کچھ ٹھوس تعمیری کام کرو۔ ان وقتی مسائل سے کب تک نمٹتی رہو گی۔ کم از کم تعلیم و ترقی میں عورتوں ہی کا شعبہ سنبھال لو۔ کئی بار انھوں نے کہا کہ بہن اگر تم انتظام کرسکتیں کہ ہر گھر میں پہنچ کر عورتوں تک تعلیم و ترقی کا پیغام پہنچا دیتیں تو بڑا کام ہو جاتا۔

اسی قسم کا ایک کام انھوں نے مجھے سپرد کرنا چاہا۔ ان کے اصرار اور خود اپنی خواہش سے مجبور ہو کر میں نے انھیں اس پر آمادہ کیا کہ مردولا سارابھائی سے بات کرلیں میں، شفیق بھائی اور صدیقہ مرحومہ تینوں وہاں گئے۔ مردولا بہن ایک دم بپھر گئیں۔ کہنے لگیں میں کبھی آپ کے ساتھیوں اور ورکرس کو نہیں بھڑکاتی اور آپ میری ساتھی کو چھیننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان دنوں ہم لوگ اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی کے سلسلے میں انتہائی مصروف تھے۔ مردولا بہن کو اسی لیے زیادہ ناگوار ہوئی تھی۔ آج بھی آنکھوں میں وہ پُرخلوص تصویر پھر رہی ہے، جب رخصت ہوتے وقت شفیق بھائی نے ہنستے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا "اچھا بہن مردولا میں اب کچھ نہ کہوں گا۔ لے جاؤ انیس بہن کو تم ہی لے جاؤ۔"

باہر نکل کر میں نے انھیں کام کی نوعیت بتائی تو بولے اس منزل پر واقعی تم نہیں چھوڑ سکتی ہو۔ کیوں کہ اجڑے ہوئے دیہاتوں کی آبادکاری بھی ہمارے پروگرام میں شامل تھی۔

آج جب شفیق بھائی اِس دُنیا میں نہیں ہیں، وہ عدول حکمیاں، اختلافِ رائے اور لڑلڑ کر اپنی بات منوانا سب کچھ یاد آرہا ہے۔ انھوں نے ایک پروگرام بنایا، میں نے کچھ کاہلی اور کچھ دوسرے کاموں میں اُلجھے رہنے کے باعث اس پر عمل نہ کیا۔ البتہ ہماری ایک جوشیلی ساتھی نے پروگرام کے کچھ حصّے کو کامیابی سے چلایا اور اس کی خبر میں نے شفیق بھائی کو سُنائی تو بے حد خوش ہوئے۔ اس کی محنت کو سراہا اور اکثر اس کا ذکر کرتے رہتے تھے۔

ہر چھوٹی اور بڑی بات حتیٰ کہ گھریلو اور سیاسی معاملات میں بھی میں ان سے صلاح لیتی رہتی تھی، لیکن پھر بھی اکثر من مانی بھی کر گزرتی اور جب غلطی کا احساس ہوتا تو وہ بھی ان سے بیان کر دیتی تھی کہ آپ کی رائے صحیح تھی، میرا ہی اندازہ غلط نکلا۔ شفیق بھائی سُنتے اور ہنستے اور دوبارہ پھر ہمارے لیے غلطیاں کرنے کا موقع فراہم کر دیتے۔ کیوں کہ وہ اس کے قائل تھے کہ اپنا راستہ خود منتخب کرو، ٹھوکریں کھاکر سبق حاصل کرو۔ وہ خود مجتہد نہیں بننا چاہتے تھے، بلکہ خواہش تھی اُن کے ہر ساتھی میں اعتماد کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ وہ چاہتے تھے، آئیڈیا اُن سے لے لیں مگر تجربہ اپنی صواب دید کے مطابق کریں۔ ناکامی ہو تو خود اس کو سنواریں۔ آپسی بحث و مباحثے کے ذریعے درستی کریں، اگر کسی نتیجے پر نہ پہنچیں تب ان سے صلاح لیں۔

وہ خود اپنا احتساب کرتے رہتے تھے اور یہی توقع ہم سے کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا جہاں کمزوری یا خامی نظر آئے قدم پیچھے ہٹانے میں پس و پیش نہ کرو، چاہے اس میں اپنی محنت اور کچھ وقار بھی قربان کرنا پڑے۔ پروا نہ کرو۔ بُرائی کا باقی رکھنا جرم ہے۔

ان کے اس نظریے نے آخری ایام میں کچھ غلط فہمی پیدا کر دی تھی۔ جوشیلے نوجوان

ساتھیوں نے اسے بے رحمی قرار دیا۔ اور وہ سوچنے لگے کہ شاید ہمیں قربانی کا بکرا سمجھ لیا گیا ہے۔ ہم تو خون پسینہ ایک کرکے ایک چیز تیار کرتے ہیں اور شفیق صاحب بہ یک جنبشِ قلم اس پر پانی پھیر دینا چاہتے ہیں، شاید ہماری عزّت و محنت کی ان کی نظر میں قدر و قیمت نہیں ہے۔

لیکن مجھے معلوم ہے۔ انھیں ساتھیوں پر بھروسا تھا، نوجوانوں سے امیدیں تھیں اور کارکنوں کے ساتھ گہرا تعلق اور ان کی محبت و خلوص کی وقعت تھی، مگر کسی اچھے کام میں بُرائی کی آمیزش وہ برداشت نہ کر پاتے تھے، کسی اچھّے مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ان کے نزدیک اچھا ہی ہونا چاہیے تھا۔

شفیق بھائی تعلیم و ترقی کی اسکیم کو تجرباتی نوعیت کی سمجھتے تھے اور سوسائٹی کی ہر شاخ تک رسائی کا ذریعہ جانتے تھے۔ دُشواریوں کا اندازہ تو بعد کو ہوا۔ کارکنوں کی غلط فہمی تھی کہ وہ ان پگڈنڈیوں کو شاہ راہ سمجھ بیٹھے۔

بیماری سے دو ہفتہ پہلے میں اسی قسم کے ایک مسئلے کو لے کر کارکنوں کی طرف سے سفارت و پیغام رسانی کے فرائض انجام دینے گئی تو انھوں نے یہی کہا کہ میں تعلیم و ترقی کے لیے متضاد تجربات کر رہا ہوں۔ انھیں میں سے ایک تعلیمی سنٹر قائم کرنے کی اسکیم بھی ہے۔ اسکول ہرگز میری اسکیم میں شامل نہیں ہیں۔ البتہ اسکولوں میں پڑھنے والے بچّوں کے اوقاتِ فرصت اس میں شامل ہیں۔ ایسے سنٹر جو چار سال بعد بھی خود کفیل نہ ہو سکیں ثابت کرتے ہیں کہ محلّوں میں یہ تجربہ ناکام رہا۔ کچھ چیزوں میں کامیابی ہوئی اور کچھ میں ناکامی۔ اس لیے دوسرا راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس پر اصرار کیوں ہے؟ اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ میری نظر میں محنت کی قدر نہیں ہے۔ ہاں آگے بڑھنے کے لیے اور کام کے لیے اور راستہ سوچنا پڑے گا۔

سماج کے انتہائی تنزّل کا ذمّے دار وہ جہالت کو سمجھتے تھے اور اخلاقی

زوال کا ذمے دار نظامِ تعلیم کو۔ اس لیے بالغوں کی تعلیم یا والدین کی ذہنی تربیت ان کے نزدیک ضروری تھی۔ خرابی جہاں سے شروع ہوتی ہے پہلے وہیں سے اس کو پکڑنا چاہیے۔

کارکنوں کی میٹنگ میں شفیق بھائی لیڈر کی طرح نہیں ایک والنٹیر کی طرح شامل ہوتے تھے۔ حتی الامکان پہلے کچھ کہنے یا تقریر کرنے سے گریز کرتے تھے۔ مجبوراً بولتے تو ایک ساتھی اور رفیقِ کار کی طرح مفید مشورے دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ سب کا کہا سُنا تو بھول جاتا، مگر ان کے چند جملے دل میں پیوست ہوجاتے ایسا لگتا کہ "گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"۔

مخالفین کی نکتہ چینی خندہ پیشانی سے سُن لیتے، لیکن کرتے وہی جسے خود ٹھیک سمجھتے تھے۔ قرول باغ میں کچھ رفیوجی لڑکے لڑکیوں نے مل کر کچھ عارضی اسکول کھول رکھے تھے۔ انھوں نے ایک روز ہم سب کو مدعو کیا۔ اس سے پہلے باڑہ ہندوراؤ کے تعلیمی سنٹر میں ہم بچّوں کا اجتماع کر چکے تھے اور اس روز پہلی بار پنجاب کے نو واردوں کو شفیق بھائی سے ملنے اور ان کے خلوص کی اہمیت محسوس کرنے کا اتفاق ہوا۔

ایک پارک میں آٹھ عدد عارضی اسکولوں کے بچّے اور ان کے نوعمر استاد اور استانیاں جمع تھیں۔ انتہائی مسرت سے سب نے استقبال کیا، چھوٹی موٹی تقریریں ہوئیں۔ شفیق بھائی نے بڑی ہی خوشی و فراخ دلی کے ساتھ ان نوجوان طالب علموں کی اس کوشش و ہمّت کو سراہا جو اپنی تباہی کو بھول کر تعمیری کام میں جُٹ گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اب قسمت نے ہمیں اور آپ سب کو ہم وطن بنادیا ہے۔ آؤ سب مل کر بلا تفریقِ مذہب و ملّت ملک کی ترقی و بہبودی کی کوشش کریں لیکن میری ایک نصیحت یاد رکھنا۔ کبھی مذہبی جنونیوں کے قریب نہ جانا۔ وہاں گئے اور دماغ بہکا۔

پھر تم ہندو، مسلمان سکھ بن کر اپنی قوم کی مدد بے شک کر سکتے ہو مگر کسی مظلوم انسان کی امداد نہ کر سکو گے۔

بہ ظاہر اپنی وضع قطع سے وہ پکے مسلمان نظر آتے تھے۔ ان کا مزاحیہ انداز آزاد منش ہونے کا ثبوت دیتا تھا۔ آوارہ گردی قلندرانہ زندگی کا نمونہ تھی۔ اور حقیقتاً مذہب کی اصل رُوح کو انھوں نے اپنے افعال و کردار میں کچھ اس طرح سمو لیا تھا کہ لوگ مغالطے میں پڑ جاتے تھے۔

ایک بار تبلیغی جماعت کے کچھ پُر جوش لوگوں نے نماز کی پابندی پر مجبور کرنے کے لیے محلّے کے سب دروازوں پر علی الصبح ڈنڈے مار مار کر لوگوں کو جگانا شروع کیا۔ شفیق بھائی جبر کے قائل ہی نہ تھے، آخر کار ان سے نہ رہا گیا۔ عاجزانہ کہنے لگے "بھائی مجھے تو بخش دو۔ کیا تم نے مجھے نماز پڑھتے کبھی دیکھا ہے۔ کہنے لگے "ہاں دیکھا تو نہیں ہے، مگر آپ مسلمان ہیں۔" بولے "اچھا تو پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" ان بے چاروں کو کیا پتا کہ جس شخص کو وہ نمازِ فجر کے لیے جگانے آئے ہیں اس کی رات کا بڑا حصّہ عبادتِ الٰہی اور دن خدمتِ خلق میں گزر رہا ہے۔ صدیقہ مرحومہ (ان کی بیوی) بیان کرتی تھیں کہ سارے دن تگ و دو کے بعد جب گھر آتے تو ذرا دیر ہنس بول کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ گھنٹوں نماز کا سلسلہ چلتا رہتا۔ شاید اسی کی طاقت دوسرے دن پھر ان کو کام میں جٹا دیتی تھی۔

رمضان کا کبھی ایک روزہ قضا نہ ہوتا، مگر اس ٹھاٹھ سے گھومتے رہتے جیسے کھاتے پیتے گپ شپ کر رہے ہوں۔

۴۷ء کے بعد جب امن و امان ہو گیا اور دریا محل میں خواجہ شفیع کے مکان میں قیام ہو گیا پھر بھی بہت دنوں تک ان کے بیوی بچے نہ آئے تو میں نے کہا اب مکان بھی مل گیا آپ دفتر بھی سنبھال چکے آخر ان سب کو کب بلوائیے گا۔ ہنس کر بولے بس ایک

دو ہفتے میں آنے ہی والے ہیں۔ مگر بھئی تمھاری صدیقہ تو بیگم صاحب ہیں بغیر دو تین نوکروں کے کیسے رہ سکیں گی۔ مجھے دیکھو اپنا کھانا خود پکا تا ہوں۔ اور کو کریں کوئی سادی سی چیز پکا کر کھا لیتا ہوں۔ میں نے کہا کوئی ہرج نہیں، ان کے نوکر آپ کا کھانا بھی پکا دیا کریں گے۔ اور شہر میں پھرنے کے لیے آپ کا یہ وقت بھی بچ جایا کرے گا۔ بولے یہ تو ٹھیک ہے مگر انھیں میرے ساتھ کافی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔

ان سب کے آنے کے بعد بھی عرصے تک مسافرت کا عالم رہا۔ کیوں کہ گھر گرہستی کو پھر سے جمانے اور نئی چیزیں فراہم کرنے میں کچھ عرصہ لگ گیا، البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سال ڈیڑھ سال بعد انھیں پکا ہوا کھانا نصیب ہونے لگا۔

رفتہ رفتہ کام پھیل گیا اور پرابلم بڑھ گئے۔ آپس میں اختلافات شروع ہو گئے۔ اور اس سے انھیں بہت تکلیف پہنچی۔ اپنی طبعی خوش خلقی کے ساتھ اس سے نمٹنے کی کوشش کی، لیکن اس موقع پر انھیں پہلی بار احساس ہوا کہ جسے وہ مضبوط اور متحد سمجھ رہے تھے، اب اس کا ہر ریشہ اپنی جداگانہ حیات اور وقار کے تحفظ پر مصر ہے۔ اب اسے پھر بل دینے کے لیے مضبوط ہاتھ اور قوی بازوؤں کی ضرورت ہے۔ تب انھیں سوچنا پڑا کہ عدم تشدد کا پجاری رائے عامّہ کے سامنے سرنگوں ہو جائے یا پھر نئے سرے سے اور نئے ڈھنگ سے شیرازہ بندی کی جائے۔ انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

ایسے وقت پر بھی دوسروں کی دل شکنی کا خیال کر کے آب دیدہ ہو جاتے تھے اور کہتے تھے" ابھی بچے ہیں۔ سمجھتے نہیں ہیں۔ مگر ان کے خلوصِ نیت میں شک نہیں ہے۔"

ایک بار کچھ واقعات سے دل برداشتہ ہو کر میں نے غصّے سے کہا "ایسا لگتا ہے کانگریس مر چکی ہے اور اب اس لاش کو کاندھے پر لادے آپ لوگ نہ جانے کب

تک پھرتے رہیں گے"۔

شفیق بھائی میری نکتہ چینی اور غصّے پر ہنستے رہے۔ اس سکون کے ساتھ کہ ان کا اطمینان دیکھ کر میرا غصّہ بھی سرد پڑ گیا۔ کافی دیر تک مجھے سمجھاتے رہے اور جب ان کے پاس سے اٹھی تو یہ سوچتی ہوئی کہ واقعی تعمیری نظریہ بہتر ہے۔ تخریب تو بہت آسان ہے کسی بنی بنائی چیز کو بگڑنے سے بچانا کوئی نئی آئیڈیالوجی اپنانے یا بے جانی بوجھی چیز پر ایمان لے آنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

منسٹر ہونے کے بعد اکثر کہا کرتے تھے "میں تو جامعہ کے لیے اب بے کار ہو گیا۔ دہلی میں الکشن ہو رہے تھے۔ میں یو پی میں مصروف تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم مجھے لکھنؤ میں ملے اور کہا کہ آپ دہلی چلی آئیے۔ شفیق انڈونیشیا میں بیٹھے ہوئے ہیں، یہاں ان کا الکشن ہو رہا ہے۔ خط تار سب جا رہے ہیں وہ کسی طرح آتے ہی نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ یونسکو کی طرف سے وہ کسی تعلیمی اسکیم کے سلسلے میں انڈونیشیا گئے تھے۔ یہاں ساتھیوں نے کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کے سامنے ان کا نام تجویز کر دیا اور اتفاق رائے سے منظور ہو گیا۔ اب الکشن ہو رہا تھا اور امیدوار صاحب غائب تھے۔

ساتھیوں نے چناؤ جیت لیا، تب ان کو کامیابی کا تار گیا۔ اس وقت تشریف لائے۔ اور ایجوکیشن منسٹر بنائے گئے۔

ایک کام سے نیاگی جی کو فون کرنا تھا۔ لوگ ان کے پاس گئے کہ آپ کہہ دیجیے۔ بولے "میں تو منسٹر بننے کے بعد بے کار ہو گیا ہوں۔ اب تم لوگ انھیں بہن کے پاس جاؤ"۔

تعلیم و ترقی کی بلڈنگ جامعہ والوں نے قرض لے کر بنوا ڈالی، مگر اب اس کی ادائگی کہاں سے ہو۔ سارے بل پڑے ہوئے تھے۔ ٹھیکے دار الگ پریشان اور تعلیم و ترقی کے ذمّے داران بالکل نروس۔ انھیں دنوں شفیق بھائی بیمار ہو کر اسپتال

چلے گئے۔ جواہر لال جی کے سامنے سارا معاملہ رکھنے کے بعد ہی کامیابی کی امید تھی اور یہ کام منٹوں میں ہو سکتا تھا۔ مگر شفیق بھائی اپنی وزارت سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ اس لیے یہ معاملہ میرے اور بیگم زیدی کے سپرد کیا۔ اور ہم نے پنڈت جی اور مولانا کے ذریعے جب مسئلے کے حل ہو جانے کی انھیں خوش خبری سنائی تو بہت خوش ہوئے۔

بیس سال تک محنت و غربت کی درویشانہ زندگی بسر کرنے کے بعد آخر وہ بھی اُسی دہلی کی سرزمین کے نیچے دائمی و ابدی نیند سو گئے جس کی گلیوں اور کوچوں میں چل پھر کر انھوں نے عوام کے فائدے، غریبوں کی بھلائی، بے کسوں کی دست گیری اور ناداروں کی تعلیم، بلکہ عوام سے جہالت دُور کرنے کے لیے اَن تھک محنت کی تھی۔ جہاں وہ طالب علم بھی رہے تھے اور اُستاد بن کر بھی طالب علم کی زندگی بسر کرتے رہے تھے۔ قافلہ سالار بن کر بھی پا پیادہ رَہرو رہے تھے اور جس وطن کے کانٹے بھی انھیں پھولوں سے زیادہ پیارے تھے۔ فقر، جستجو اور حیاتِ قلندرانہ سے معمور ایک دیوانہ جامعہ ملیہ کے گوشے میں آسودۂ خاک ہو گیا ؎

بندۂ آزاد را شانِ دگر
مرگ او را می دہد جانے دگر

۵۔ چودھری محمد علی ردولوی

سُرخ و سفید رنگ، خوب گھنی سیاہ بڑی بڑی مونچھیں۔ ململ کا کرتا۔ اس پر انگرکھا۔ بڑی مُہری کا لٹھے کا پاجامہ۔ کبھی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ۔ ایک شاندار ملازم ساتھ، لڈوؤں کی ہانڈی، شراب کی بوتلیں اور سوڈے کا کیس تھامے ہوئے۔ بڑے بے تکلفانہ انداز میں پھاٹک سے داخل ہوتے۔ ان کی غیر معمولی شوخی وظرافت اور کھُلے ہوئے ہاتھ کی بدولت بچّوں، بوڑھوں اور نوکروں سبھی کو ان کی آمد کی خوشی ہوتی۔ بزرگوں تک کو تحفہ تحائف سے نوازتے، نوکروں پر انعام واکرام کی بارش ہوتی، اور بچّے مٹھائی کی ہانڈیاں فوراً اچک لیتے۔

میرے والد سے ان کی دوستی کی ابتدا اُن دنوں ہوئی تھی جب وہ نئے نئے علی گڑھ سے وکالت پاس کرکے بارہ بنکی آئے تھے اور پریکٹس شروع کی تھی۔ محمد علی چچا کا علاقہ کورٹ تھا اور وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح علاقہ واگذار ہو جائے۔ برٹش گورنمنٹ ہر راجا یا تعلقدار کے نابالغ لڑکے کو اپنی سرپرستی میں لے کر اس کا علاقہ کورٹ آف وارڈس کے سپرد کر دیتی تھی۔ اگر بیٹا ناخلف نکلا تو ضبطی کا بہانہ مل جاتا تھا۔ ورنہ اکثر جوان ہوتے ہی لوگ اپنی جائداد چھڑانے کی کوشش کرتے تھے اور زیادہ تر کامیاب بھی ہوتے تھے۔

محمد علی چچا بھی کامیاب ہو گئے۔ ریاست چھُٹی تو وہ بھی تمام بندھنوں

سے رہا ہو گئے ۔ کالون اسکول (جو اب کالج ہے) راجاؤں اور تعلقداروں کے بچوں کے لیے مخصوص تھا، وہیں تعلیم پائی تھی۔ والدین کے اکلوتے بیٹے تھے، ایک بڑی بہن تھی جس کی شادی ہو چکی تھی۔ اس لیے گھر میں سارا لاڈ پیار، شان، رنگ رلیاں ان کی تھیں۔

سنتی ہوں، ردولی کی دو حسین ترین بیگمات میں سے ایک ان کی والدہ تھیں ۔ حالاں کہ میں نے جب دیکھا ضعیف ہو چکی تھیں اور حلیہ بدل چکا تھا۔ بس آثار کہہ رہے تھے کہ عمارت عظیم رہی ہو گی ۔ بڑے کلّے ٹھلّے کی بیوی تھیں۔ انیسویں صدی کے دل پھینک تعلقدار کی ان گنت محبوباؤں کے ہوتے ہوئے بھی بیگم کا رعب و دبدبہ اور عزّت و احترام مثالی تھا۔

ایک واقعہ ان ہی لوگوں کی زبانی سنا ہوا یاد ہے کہ تعلقدار مرحوم کا قاعدہ تھا کہ بیگم کو خوش کرنے اور راضی بہ رضا رکھنے کے لیے اکثر نفیس زیورات اور ملبوسات تحفے میں دیا کرتے تھے ۔ خاص طور پر اگر بائی صاحبان کے لیے کوئی زیور خریدتے تو بالکل اسی طرح کا بیگم کے لیے بھی آتا ۔ یوں چاندی سونے کی بارش کر کے بیوی کے غیظ و غضب کو ٹالا کرتے تھے۔

ایسے ہی ایک موقع پر ارباب نشاط میں سے کسی نے خواہش کی کہ میرا آپ کی طرح اچکن پہننے کو جی چاہ رہا ہے ۔ فوراً لکھنؤ کے کاریگروں سے زردوزی سے مرصّع اچکن سِلوائی مگر ایک نہیں دو عدد ۔ ایک فرمائش کرنے والی کو عنایت ہوئی دوسری خود لے کر خوش خوش بیوی کے پاس پہنچے ۔ بیگم نے کھولی، دیکھا اور اپنا سر پیٹ لیا۔

"میں کہتی ہوں، تمھاری غیرت کو کیا ہو گیا ہے ۔ اللہ کی شان اب مجھے موئی ٹھکاہیوں اور ناچنے والیوں کا سا لباس پہناؤ گے ۔ ایسا دیدہ ہوائی ہے کہ شریف زادیو

اور کمینوں کا فرق بھی مٹ گیا۔ ایسے پہننے والیوں پر اللہ کی مار بس اور کیا کہوں لو دیکھو۔"

اور یہ کہہ کر جھٹ کپڑوں کو دیا سلائی دکھا دی۔ اچکن جل کر خاک ہو گئی اور میاں بے چارے ایک لفظ بھی نہ بول سکے۔

ہاں تو صاحب وہی مرتضائی بیگم ہمارے محمد علی چچا کی والدہ تھیں۔ بہت سخت مذہبی تھیں، اس لیے محمد علی چچا کی سنّی بیوی کے آتے ہی انھوں نے برابر کے مکان میں رہائش اختیار کرلی اور انھیں آزاد چھوڑ دیا۔ دن میں دو چار بار آکر بیٹے بہو کو ڈانٹ ڈپٹ جاتیں۔ باقی اپنے حصّے میں نذر و نیاز، مجلس، تعزیہ داری، ماتم سب کرتی رہتیں، کیوں کہ محمد علی چچا نے آخر عمر میں تعزیہ داری بند کر دی تھی۔

محمد علی چچا کے مصاحبین میں حکیم نعمت رسول (جو اُن کی بیوی کے حقیقی چچازاد بھائی بھی تھے)، منیجر نوشاد علی صاحب اور خاصے کی چیز میاں مٹھو ملازم تھے۔ اور چچا کا حکم تھا کہ پرانے نوکروں کو دادا۔ چچا۔ ماموں کہہ کر بلایا جائے، تاکہ ان کو یہ محسوس ہو کہ وہ بھی خاندان کے ایک فرد ہیں۔

میرے والد (ولایت علی صاحب) کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں میں سب سے زیادہ محبت و خلوص ہمیں ان ہی سے ملا۔ خود کہا کرتے تھے کہ دو آدمیوں نے میری زندگی تلخ کر دی۔ ایک ولایت دوسرے بیوی۔ والد کے انتقال کے بعد بھی وہ ہم سے ملنے مسولی آیا کرتے تھے اور میرے چھوٹے بھائی ردولی بھی پہنچتے تھے۔

پھر جب لکھنؤ میں ہمارا قیام ہوا تو اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ہزاروں قصّے ان کے پاس تھے، اور سننے والوں کا کثیر مجمع۔ سارے لڑکے لڑکیاں ان کو گھیر لیتے اور اس وقت کوئی دیکھتا ان کی گل افشانی گفتار۔ لکھنوی اور قصباتی دونوں

زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ فارسی اور انگریزی میں بھی برق تھے۔ 'امامن مہری' کے فلسفیانہ خیالات لکھ کر ساری عورتوں پر بیگماتی زبان کے ماہر ہونے کا سکّہ انھوں نے بٹھا دیا تھا۔ رئیس زادے ہوتے ہوئے بھی عوام میں گھل مل کر اودھی زبان کے لطیفے، مثالیں اور کہانیاں بھی ازبر کر لی تھیں۔

کپڑے، زیورات، تمیز تہذیب اور معاشرتی رکھ رکھاؤ ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ مجھے یاد ہے جب انھوں نے 'صلاح کار' لکھی ہے تو ہم لوگ خوب ہنستے تھے کہ خدا کی شان! نوجوانوں کے صلاح کار محمد علی چچا بن گئے، جن کے دل پھینک اور دل نواز ہونے کے چرچے سارے ضلع میں پھیلے ہوئے تھے۔

انگریزی تہذیب سے مرعوب تھے اور اپنی تہذیب کے عاشق۔ اسلامی اور ہندستانی کلچر نے ان کا دل موہ لیا تھا۔ خاص طور سے مسلمان عورتوں کو وہ چاہتے تھے کہ اس راہ سے قدم نہ ہٹائیں۔ ویسے تعلیم نسواں کے ان دنوں بہت بڑے چمپین تھے۔ ایک روز کہنے لگے، بھئی بیوی کو تو ایسا ضرور ہونا چاہیے کہ اپنے شوہر کی خوش ذوقی و سخن شناسی کی قدرداں ہو اور اسے سمجھ سکتی ہو۔ تمھیں معلوم ہے؟ فلاں صاحب کا کیا لطیفہ ہوا۔ اتنا بڑا شاعر سارا وقت فکرِ سخن میں کھویا رہنے والا۔ اس نے بیوی سے نکھٹّو کا خطاب پایا۔ ایک دن ان کے دماغ میں ایک مصرع آیا۔ مصرع بڑا زوردار تھا۔ دن گزر گیا، رات آگئی، چراغ پاس رکھے اور قلم ہاتھ میں لیے بیٹھے ہیں مگر دوسرے مصرع کا تک ہی نہیں بیٹھ رہا تھا۔ ایک بارگی روشنی نمودار ہوئی اور دوسرا مصرع برجستہ نکل پڑا زور سے پکار اٹھے وہ مارا۔ کیا لاجواب شعر ہوا ہے۔

بیوی سو چکی تھی۔ آواز سن کر چونک پڑی اے ہے کیا ہوا۔ کیوں چلاّئے۔ عاجزی سے کہا۔ بیگم بس سن لو۔ کیا معرکے کا مطلع ہوا ہے۔ شعر کچھ اس قسم کا تھا

(اگرچہ انھوں نے سُنایا تھا یاد نہیں رہا) باغ تھا، بہار تھی شبنم نے رات کو موتی لٹائے تھے اور وہ سروِ ناز نظارۂ صبح میں محو تھی۔ تشنہ لبانِ دیدار ہم جلوے تھے وغیرہ وغیرہ۔

بیوی نے شعر سُن کر کروٹ بدل لی "میں کہتی ہوں تم جھوٹ کتنا بولتے ہو۔" یہ داد ملی۔ بے چارے کا منھ اتنا سا رہ گیا۔

ایک دن اپنی نئی نئی شادی کا اور بیوی پر فریفتگی کا قصہ بیان کرنے لگے کہ میری بیوی کے پیٹ میں زور کا درد اُٹھا۔ میں دواؤں پر دوائیں دے رہا تھا اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اتنے میں قصبے کی ایک بیوی ملنے کو آگئیں۔ وہ کراہ رہی تھیں اور میں بے تاب ہو رہا تھا۔ درد کی شدّت سے انھوں نے ایک چیخ ماری اور میں دیوانہ وار یہ کہتا ہوا ان پر جھک پڑا "جانِ من میں کیا کروں کیسے تمھاری تکلیف دُور کروں۔"

مہمان بیوی نے جو یہ سماں دیکھا تو ڈوپٹے سے اپنا آدھا چہرہ ڈھک لیا۔ اور بولیں "بھیّا مجھے کوئی ڈولی بُلا دو میں اپنے گھر جاؤں، اب یہاں جانِ من وانِ من ہونے لگا ہے۔"

مولانا کرامت حسین نے اسکول کھولا تو پہلی لڑکیاں محمد علی چچا کی داخل ہوئیں میرے والد کو شاید وہ راضی نہ کر سکے اس لیے میری حسرت پوری نہ ہو سکی۔

دو ہی سال کے اندر ماں نے آفت مچا دی اور دونوں بڑی لڑکیاں واپس بلائی گئیں۔ تب ان کی تعلیم کے لیے ایک حسین نوجوان انگریز لیڈی کا تقرر ہوا، جو انھیں لکھنا پڑھنا اور بولنا سکھاتی تھی۔

لڑکیاں تو برائے نام تعلیم حاصل کر سکیں مگر چچا کے تعلقات اتنے بڑھ گئے کہ چچی کو اندیشہ پیدا ہو گیا اور والدہ تو شمشیرِ برہنہ ہو گئیں۔ ناچار ٹیچر صاحبہ کو رخصت کرنا

پڑا۔ انھوں نے اپنے اور بچّی کے گزارے کا دعویٰ دائر کر دیا۔ آخر کار وکلاء نے درمیان میں پڑ کر خطیر رقم ماں بچّی کی کفالت کے لیے دے کر چھٹکارا دلوا دیا۔

بیوی بڑی خدا ترس، مرنجاں مرنج اور مذہبی تھیں۔ حج کو جانے لگیں تو چچا ممبئی تک چھوڑنے گئے۔ جُدائی کے وقت بیوی کے آنسو نکل پڑے۔ پھر کیا تھا۔ دوڑ دھوپ کر کے جہاز پر جگہ حاصل کی اور خود بھی حج کو روانہ ہو گئے۔ یہ خبر سُن کر سب حیران رہ گئے۔

واپس آئے تو ہم نے کہا۔ چچا آپ اور حج۔ یہ معجزہ کیسے ہو گیا۔ کہنے لگے یہ بیوی تھی جو مجھے اس دربار میں لے گئی۔ مگر مدینے پہنچ کر بہت ہی دل خوش ہوا۔ بے حد لطف آیا۔

حج سے آنے کے بعد نماز بھی پڑھنے لگے۔ انھوں نے ایک کتاب 'میرا مذہب' بھی لکھی اور اسے پڑھ کر مجھ سے خاصا الجھاوا رہا۔ میں نے کہا، مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ آپ شیعہ فقہ پسند ہیں، کیوں کہ میں دونوں فقہ سے نابلد ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ شیعہ فقہ میں آپ کو صرف متعہ اور تقیہ ہی کیوں پسند آیا۔ اگر تقیہ شریعت کی چیز تھی اور جائز تھی تو حضرت علیؓ نے، حضرت امام حسنؓ و امام حسینؓ نے اور حضرت زینبؓ نے کیوں تقیہ نہیں کیا؟

کہنے لگے۔ امام تقیہ نہیں کر سکتا۔ یہ تو عوام اور کمزوروں کے لیے جائز ہے۔ بہت دیر اس پر بحث رہی، مگر نہ وہ مجھے قائل کر سکے نہ میں انھیں۔

شادی بھی سُنّی بیوی سے ہوئی۔ اور ایسی کٹر کہ سب صعوبتیں سہہ لیں مگر ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ آخر کار چچا نے خاندان والوں سے ان کا پیچھا چھڑایا اور سب کو اس پر راضی کر لیا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔

دوسرا نکاح بھی سُنّی عورت ہی سے کیا۔ شیعہ اور سُنّی فقہ سب پڑھ ڈالیں۔

قرآن اور حدیث کا وِرد رکھا۔ ادبی ذوق کی تکمیل کے لیے تمام شعرا اور ادیبوں سے تعلقات بڑھائے۔ اچھا کتب خانہ جمع کر رکھا تھا۔ ہر موضوع پر اور ہر زبان میں پڑھتے تھے۔ اس لیے بہت وسیع معلومات تھیں۔

۲۱ء سے ۳۰ء تک کانگریس سے بھی بہت دل چسپی رہی۔ جواہر لال جی سے دوستانہ تعلقات رہے۔ ایک پہیے دار چرخا بھی ایجاد کیا تھا۔ مجھے بھی تحفہ دیا تھا۔ اور اس کا نام "چمرو چرخا" رکھا تھا۔ چمرو ان کے نام کا جزو تھا جسے فخریہ استعمال کرتے تھے۔ ان کی ماں کے بچّے نہیں جیتے تھے۔ ایک کثیر الاولاد چمار کے ہاتھ انھیں ٹکے میں بیچ دیا تھا۔ اس لیے 'چمرو' ان کا تخلص بن کر رہ گیا تھا۔ اس چمار کے خاندان پر ہمیشہ نظرِ عنایت رہی۔

محمد علی چچا، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں، بیوی کے عاشقِ زار ہوتے ہوئے بھی بلا کے حُسن پرست تھے۔ خوبصورت خوبصورت کپڑا، حتّٰی کہ کراکری اور فرنیچر تک دیکھ کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ اپنے بچّوں سے شدید محبت تھی اور دوستوں کے بچّوں سے بھی گہرا لگاؤ۔

اکثر ان کی حُسن پرستی کے قصّے زبان زدِ عام ہوتے۔ چچا سے پوچھو تو کبھی انکار نہ کرتے۔ جب یو۔ پی کونسل میں زنانِ بازاری کے اخراج اور ان کو لائسنس عصمت فروشی نہ دینے کا سوال آیا تو محمد علی چچا نے مخالفت میں بڑی زوردار تقریر کی اور کہا کہ ہمیشہ سے رؤسا کے بچّے علمِ مجلس سیکھنے کے لیے طوائفوں کے یہاں جاتے رہتے ہیں۔

اور ہم لوگ یہ پڑھ کر ان سے جھگڑ پڑے۔ بہت دیر گرما گرمی رہی، ہنس ہنس کر انھوں نے بہت سے لطیفے سُنائے۔ مگر یہ ایک بات بڑے پتے کی کہہ گئے کہ اگر یہ اڈّے ختم کر دیے گئے، جہاں سوسائٹی کا فاسد عنصر نکال کر ڈالا جاتا ہے تو ہر

گھر میں ایسے اڈے کھل جائیں گے اور شریف زادیوں کی اصلاح ختم ہو جائے گی۔

لطف یہ ہے کہ اپنی بیوی، بیٹوں اور تمام رشتہ داروں، عورتوں کے لیے وہ اخلاق، شرافت، شوہروں سے وفاداری وغیرہ لازمی سمجھتے تھے۔ مگر پرانے جاگیردارانہ نظام میں پرورش پانے کا اتنا گہرا اثر تھا کہ مردوں کے لیے نظر بازی و شاہد پرستی میں کوئی برائی نہیں سمجھتے تھے۔ محمد علی چچا، عجیب معجونِ مرکب تھے۔ میرے والد کے تقدس و معصومیت کے قائل تھے، مگر کسی مجتہد یا مولوی کی برتری و بزرگی پر برافروختہ ہو جاتے تھے۔

وہ بہ یک وقت صوفی منش بھی تھے اور رنگین مزاج بھی۔ ان کی ذات میں تلوّن، سخاوت، خوش مزاجی اور مغلوب الغضبی کا حیرت انگیز امتزاج تھا۔ رسولؐ اور آلِ رسول سے محبت رکھتے ہوئے بھی نکاح خود بیٹھ کر پڑھ لیتے اور اس کو جائز سمجھتے اور بلا متعہ کیے کسی عورت سے ملنا گناہ سمجھتے تھے۔

ہم لوگ ایک آدھ بار رات کو بھی ردولی پہنچے۔ مگر پوری پوری خاطر مدارات سے مستفیض ہو کر رات کے بارہ ایک بجے واپس لوٹے۔ اس وقت ان کی خوشی قابلِ دید ہوتی تھی۔ چاہتے تھے کیا کچھ ہمیں کھلا دیں اور کتنی خاطر کریں۔

بلا کے ذہین، غیر معمولی خوش مزاج۔ کھلا ہوا دل، کھلا ہوا ہاتھ، وسیع مطالعہ اور زندگی کا بھرپور تجربہ، کیوں کہ انھوں نے جی بھر کر زندگی سے لطف اٹھایا تھا، بلا کسی دغدغے کھٹکے کے زندگی کی بہاروں میں ہر پھول سے رس نچوڑا تھا۔

اور پھر وہ زمانہ بھی آیا کہ وقت نے چہرے پر اپنے نشان ثبت کر دینے شروع کر دیے۔ سیاہی سفیدی سے، سرخی تانبے سے اور اعضا کی توانائی فالج کی مار سے بدلی۔

پہلی بیوی کے انتقال کو عرصہ ہو گیا تھا۔ مگر ایک دن سج بن کر باہر نکلے: ایک

کاشت کار نے ٹوکا۔ چودھری صاحب کیا بیاہ کرنے والے ہو اور پھر سچ مچ انھوں نے ایک جوان عورت سے نکاح کر لیا۔

ایک بار لکھنؤ آئے تو کہنے لگے۔ بھئی میں تو بڈھا ہوں اور یہ ہیں بالکل جوان۔ اس لیے وجّو (میرے بھائی) دیکھو اگر میں نہ رہوں، تو تم ان کی سرپرستی کرنا۔

میرے منھ سے بے ساختہ نکلا۔ ہائے چچا چوٹٹی کتیا اور جلیبیوں کی رکھوالی۔ محمد علی چچا بہت محظوظ ہوئے۔ جا کر سب لڑکیوں کو بتایا کہ آج انیس نے یہ جملہ کہا ہے۔ مگر قیصر (ان کی نئی بیوی) رو دیں۔ انھوں نے بہت شکایت کی کہ تم نے میرے لیے ایسا کیوں کہا۔

آخر زمانے میں مسوری میں کافی دن ساتھ رہا۔ نچلی منزل ان کے پاس تھی۔ اوپر کی میرے پاس۔ انہی دنوں ایک صاحب مع برقع پوش خاتون کے چچا کے پاس آئے اور طالبِ مدد ہوئے کہ مسوری میں جیب کٹ گئی ہے۔ بہت پریشان ہوں۔ نہ پیسہ پاس ہے نہ رہنے کا ٹھکانا اور زنانہ ساتھ ہے۔ چچا بے ساختہ بولے۔ "اور زنانہ بھی اپنا نہیں پرایا ہے"۔ اتنا سننا تھا کہ ان کا چہرہ فق ہو گیا۔ چچا نے کچھ رقم ہاتھ پر رکھ دی اور وہ فوراً چل دیے۔ ہم لوگوں نے کہا کہ آپ کو کیسے اندازہ ہوا کہ زنانہ پرایا ہے۔ بہت ہنسے کہنے لگے "دریافت کر لو۔ دوسرے ہی کا نکلے گا"۔

بعد کو معلوم ہوا کہ ان کا اندازہ صحیح تھا۔ واقعی زنانہ کہیں سے اڑا لائے تھے۔

پہاڑیوں کے رسم و رواج کا ذکر ہو رہا تھا کہنے لگے۔ بھئی نینی تال میں ایک پہاڑی میرے پاس آیا۔ کہنے لگا۔ صاحب! آپ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہمارا ایک کاغذ لکھ دو۔ میں نے قلم سنبھالا اور کہا بتاؤ کیا لکھوں۔ اس نے کہا ہمارے پاس دو عورت ہے اور اس کا عورت مر گیا ہے۔ مگر اس کے پاس ایک گھوڑی ہے۔ ہم ایک عورت اس کو دے دیا ہے اور یہ اپنا گھوڑی ہم کو دے گا۔ اس کا پکا کاغذ لکھ دو۔ اور یہ عہد نامہ

میں نے لکھ دیا۔

عجیب باغ و بہار شخصیت تھی۔ خالص جاگیرداری ماحول کی پیداوار۔ نہ اب کسی کو اتنے مواقع ہیں نہ فرصت۔ اس لیے میں نے سوچا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کر دوں۔ کیوں کہ اس دور میں نہ ایسی شخصیتیں بنیں گی، نہ ان کی ضرورت ہے۔ ایک بات اور بتا دوں۔ بوالہوسی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اور فن کارانہ عیّاشی کو آرٹ سمجھتے تھے اور اپنا پیدائشی حق۔

خدا مغفرت کرے۔ جب تک جیے خوش رہے۔ دوسروں کو خوش رکھا اور سب کو خوش دیکھنا پسند کیا۔ آخر میں فالج سے معذور ردولی میں بیٹھ رہے تھے۔ بچّے سب پاکستان چلے گئے تھے۔ دو چھوٹے لڑکے پاس تھے۔ اس میں ایک خبط الحواس تھا۔ دوسرا ابھی پڑھ رہا تھا۔ اس وقت وہی ردولی میں ان کا نام لیوا ہے۔ بڑی حسرت دغم سے پاکستان جانے والے لڑکے ولڑکیوں کو یاد کرتے تھے۔

محفلوں کی رونق، جلسوں کے صدرنشین، دوستوں کے محبوب اور مذہبی حلقوں سے برسرپیکار۔ یہ تھے محمد علی چچا!

وہ صاحبِ طرز ادیب اور افسانہ نگار بھی تھے۔ افسانوں کے دو مجموعوں کے علاوہ ان کے نام کو زندہ رکھنے والی متعدد کتابیں بھی ہیں۔ مثلاً اتالیق بیوی، صلاح کار، حیاتِ کرامت حسین، میرا مذہب اور کشکول محمد علی شاہ فقیر وغیرہ۔ آرٹ کی پرکھ پر ایک مختصر سا کتابچہ "نقادی کے نکتے" کے نام سے اور دوسرا فیملی پلاننگ پر "پردے کی بات" کے نام سے لکھا تھا، اگرچہ اس وقت فیملی پلاننگ کا کسی کو خیال بھی نہ آیا تھا۔ "گویا دبستان کھل گیا" کے نام سے ان کے خطوط کا ایک مجموعہ ان کی بیٹی ہما بیگم نے، ان کی زندگی ہی میں لاہور (پاکستان) سے شائع کیا تھا۔ اب ان کی کتابوں کے نام سے بھی بہت کم لوگ واقف ہیں۔

۶۔ مرزا ابوالفضل

جواہرلال جی الہ آباد میونسپلٹی کے صدر چُنے گئے اور ان کے پہلی بار میونسپلٹی چیئر پر آنے کی وجہ سے میونسپل ہال کے سامنے دورُویہ استقبال کرنے والوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ ایسے میں اوما نہرو نے دیکھا ایک دُبلا پتلا آدمی کھدر پوش ہر بار دب کر لائن میں پیچھے ہو جانے کی کوشش کر رہا ہے، مگر جواہرلال جی کی نظر پڑ ہی گئی۔ انھوں نے کہا" بھابھی آپ نے دیکھا یہ جو آدمی دبنے کی کوشش کر رہا ہے، یہ مرزا ابوالفضل ہے۔ اتنا پڑھا لکھا ہوتے ہوئے کیسا دبک رہا ہے۔ اور انھوں نے بڑھ کر ہاتھ ملا لیا۔

یہ تھے کم آمیز، کم گو اور پرلے درجے کے سنکی مرزا ابوالفضل، انگلش، فرنچ، عربی اور کئی زبانوں کے ماہر اور اسلام کو ماڈرن ایج کے قابل بنانے کی کوشش میں منہمک۔

میں ۲۹ء میں جب الہ آباد گئی، تو ان دنوں شفیع صاحب کے پاس وہ اکثر آیا کرتے تھے اور چھوٹے چھوٹے پمفلٹ کی شکل میں اسلام پر اپنی ریسرچ کا خلاصہ دے جایا کرتے تھے۔ انھوں نے شاید کچھ احادیث کا ترجمہ فرنچ میں اور قرآن کا انگریزی میں مکمل کیا تھا۔

انھیں دنوں میری بڑی لڑکی چیچک میں مبتلا ہو گئی۔ میں خود بیمار تھی، اس لیے

اس کی تیمارداری اور دیکھ بھال شفیع صاحب خود کرتے تھے۔ مرزا صاحب اکثر اس سلسلے میں مفید مشورے بھی دیا کرتے تھے، لیکن جب وہ اچھی ہوئی تو اس کا داغ دار چہرہ اور گہرا سانولا رنگ دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے۔ اور دوسرے دن ایک چھوٹی سی شیشی میں کوئی تیل لے کر آئے کہ یہ ایک جڑی بوٹی سے تیار کیا گیا ہے اور میں نے اپنی لڑکی پر استعمال کیا تھا جب اس کے چیچک نکلی تھی۔ ایک پاؤ تل کے تیل میں اس کے صرف سات قطرے ٹپکا کر مالش کرائیے، رنگ بھی کھل جائے گا اور داغ بھی غائب ہو جائیں گے۔ میری ہمت نہیں پڑتی تھی مگر شفیع صاحب جہاں گرد مرزا صاحب کی عقل مندی و خلوص کے اتنے قائل تھے کہ بچی پر آزما ڈالا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ چند ہی دن میں داغ بالکل غائب ہو گئے اور اصلی رنگ واپس آ گیا، ایسا کہ کسی کو یقین ہی نہیں آتا تھا، اتنی بڑی چیچک اس کے نکل چکی ہے۔

اسی سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ یہ ہوا کہ لڑکی کی خدمت کرنے والی ایک جوان چیچک رو عورت نے یہ سوچ کر کہ تازہ داغوں کے لیے تو یہ سات قطرے اکسیر بن گئے ہیں، میں اگر اس دوا کو بغیر تل کے تیل کے استعمال کرلوں تو میرا چہرہ بھی صاف ہو جائے گا اور دو انگلیوں میں دوا لے کر اس نے اپنے گال پر لگائی تھی کہ آفت ہو گئی۔ اتنا حصّہ جل کر رہ گیا۔ پوچھتے پوچھتے جب یہ بھید کھلا تو ٹھنڈک کا انتظام کرنا پڑا۔

مرزا صاحب نے دو لڑکیاں پالی تھیں۔ انھیں وہ سائکل پہ باری باری اسکول پہنچانے جایا کرتے تھے اور اس پر محلے کے قدامت پسند مسلمانوں کو سخت اعتراض تھا کہ وہ نہ شادی کے نہ بیاہ کے دو دو سیانی لڑکیوں کے باپ بن کر انھیں سائیکل پر لیے لیے گھومتے ہیں۔ لیکن ان کے محبت بھرے دل میں ان بچیوں کے لیے، جو یتیم و یسیر ان کی سرپرستی میں تھیں، والدین سے زیادہ شفقت و مرحمت تھی اور وہی ان کے کفیل تھے۔

ان دنوں جواہر لال جی نے ان کو میونسپلٹی میں کوئی چھوٹی سی ملازمت دے دی

تھی، جو گزر بسر کا ذریعہ تھی۔ سال با سال تک ہندستان سے باہر رہنے کے بعد اب وہ یہ طے کرکے آئے تھے کہ ہندستان کی تحریکِ آزادی میں حصّہ لیں گے۔ مجھے نہیں معلوم انھوں نے کتنا حصّہ لیا، مگر کانگریس آفس سے کسی نہ کسی طرح ان کا تعلق قائم رہا۔ بے حد سادہ اور غریبانہ طرزِ حیات تھا۔ مذاہبِ عالم پر غور و فکر اور نئے نئے نکتے پیدا کرنے میں وقت صرف کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے جب انھوں نے سورۂ فاتحہ کی خود ساختہ تفسیر ہمیں دی تو ایک گھنٹے تک شفیع صاحب کو اس کے نکات سمجھائے۔ میرا ان دنوں سخت پردہ تھا شفیع صاحب کسی قدر قائل ہو کر جب مجھے رحمان و رحیم کی وجہِ تسمیہ سمجھانے لگے، تو میں ان سے لڑ پڑی اور مرزا صاحب کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

مرزا صاحب کا خیال تھا، یہ غلط ہے کہ خدا باپ سے زیادہ شفیق ہے نہیں وہ ماں سے زیادہ مہربان ہے۔ اور (نعوذ باللہ) رحمِ مادری کی مناسبت سے اس نے اپنا لقب رحمان و رحیم رکھا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال سورۂ فاتحہ کے معنی و مطالب طرح طرح سے سمجھائے گئے تھے لیکن افسوس ہے، ایک ہی سال بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دار و گیر شروع ہو گئی۔ اور مجھے گاؤں واپس جانا پڑا۔ مرزا صاحب بھولے بسرے ہو گئے۔ چند سال ہوئے ان کے انتقال کی خبر اخبار میں پڑھی، تو پرانی یادوں نے کروٹ لی۔ مگر اب کوئی ذریعہ دریافتِ حال کا میرے پاس نہ تھا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ عسرت اور تنگ دستی میں بھی وہ دوسروں کی امداد پر کمر بستہ رہتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ مرزا صاحب کے دماغ میں اللہ تعالیٰ کا تصور کسی دیوی ماتا کی طرح گھس گیا تھا۔ اس لیے وہ اسے کھرچ نہ سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی قابلیت اور تدبیر و فراست کے اس حد تک قائل تھے کہ یہ ماننے پر کبھی تیار نہ ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

امّی تھے ۔ کہتے تھے بھلا خیال تو کیجیے اتنا ذی علم و قابل انسان جس نے قرآن جیسی عظیم کتاب لکھ دی اور جس کے اقوال (احادیثِ مبارکہ) اتنے جامع ہوں وہ کیسے اَن پڑھ ہو سکتا ہے ۔ اپنے خیال، عمل، فکر تحقیق میں ہمیشہ انفرادیت کو برقرار رکھتے تھے ۔ اس لیے دو چار کے سوا ان کا کوئی شناسا نہ تھا ۔ اور ان میں ایک جواہر لال جی تھے ۔

۷۔ ڈاکٹر کچلو

۱۵ ارمئی ۱۹۷۳ء کے ہفتہ وار الجمعیت میں گورمکھ سنگھ مسافر کا ایک مضمون ڈاکٹر سیف الدین کچلو پر پڑھ کر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔ تعجب اس لیے کہ برسوں کے بعد مجاہدینِ آزادی کی صف میں ایک بھولے بسرے کمانڈر کو لا کھڑا کیا گیا تھا' اور خوشی یوں کہ ابھی کچھ ایسے دوست موجود ہیں جو ڈاکٹر کچلو کا نام محبت سے یاد کر سکتے ہیں۔

ویسے کوئی بھی پنجاب کی تاریخ لکھنے والا اُن کے نام کو یوں نظر انداز نہیں کر سکتا، اگرچہ زندگی کے آخری دَور میں وہ دُودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکے جا چکے تھے۔

مجھے بھی چند سال اُن سے شرفِ ملاقات حاصل رہا۔ اگرچہ یہ اُن کا دَورِ تنزّل تھا اور میرا زمانہ شکستگی و از خود رفتگی۔ شاید اسی لیے تھوڑا دیکھا، تھوڑا سمجھا اور بہت کم قربت رہی۔

واقعات اور حقیقتِ حال کو جوڑ کر شاید ان کی کوئی مکمل تصویر بن سکے۔ اس لیے دیانت داری کا تقاضا ہے کہ جو جس نے دیکھا ہو لکھ دے۔

حافظے کی خرابی کہیے یا طوفانی حوادث کا تقاضا اس وقت، بالکل یاد نہیں آرہا ہے کہ ڈاکٹر کچلو کن تاریخوں میں دہلی آئے تھے۔ دسمبر ۴۷ء ہو یا جنوری ۴۸ء

ان سے پہلی بار کھانے کی میز پر ملاقات ہوئی۔ رفیع صاحب کے پاس والی میز پر بوڑھا سیاست دان خاموش بیٹھا تھا۔ رفیع صاحب جب کوئی بات کہتے تو ایک کان پر ہاتھ رکھ کر اور دوسرا جھکا کر وہ سنتے اور جواب دینے کی کوشش کرتے۔

جلیان والا باغ کا ہیرو مہمان تنہا تھا۔ فسادات کے بعد وہ امرتسر سے لاہور پہنچے کیونکہ بال بچّے سب وہیں تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کی جانیں بچا کر انھیں پاکستان سے صحیح سلامت ہندستان بھجوانے کی کوشش کوئی آسان کام تو نہ تھا۔ بپھرے ہوئے مجمع نے گھیر گھیر لیا۔ مار پیٹ ہوئی اور ایک کان کا پردہ پھٹ گیا۔ پھر گھراؤ ہوا۔ رشتہ داروں اور دوستوں نے قتل کرنے کی کوشش تو ناکام بنادی، مگر اب ایک سنٹ بھی لاہور میں رکنا ناممکن تھا۔ مردولا سارا بھائی ان کو بچا کر ہندستان لے آئیں۔

نہ وہ امرتسر میں دوستوں میں تھے، نہ لاہور میں کوئی حامی و مددگار تھا اور نہ ہی ہندستان ان کی پذیرائی کے لیے تیار تھا، اگرچہ ان کا وطن امرتسر تھا، جہاں سے لٹ پٹ کر بہ مشکل جان بچا کر لاہور اور پھر دہلی پہنچے تھے۔ اور اب ان کا کوئی گھر نہ تھا۔ نہ کوئی ذریعۂ آمدنی نہ وہ کسی ملک کے شہری تھے نہ کسی پارٹی سے وابستہ۔ ہندستان میں ان کے بے شمار دوست تھے، مگر ان دنوں صرف تین سے شناسائی تھی۔ گاندھی جی، جواہر لال اور رفیع صاحب۔

گاندھی جی شہید ہوئے۔ رفیع صاحب ان کے میزبان تھے۔ جواہر لال ان کے سرپرست۔ کانگریس اس لیے ان کے خلاف تھی کہ انھوں نے تنظیم کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ مسلم لیگی پاکستان کا سب سے بڑا دشمن ان کو سمجھ رہے تھے۔ رہے اکالی تو وہ اپنا لیڈر بنا کر ڈاکٹر کچلو کو اسلامی جمعیۃ سے خارج کرا چکے تھے۔ اور اب ان کی تمام جائداد پر پنجاب کے ہندو سکھ قابض تھے۔ اس وقت وہ کسی کے لیڈر

نہ تھے۔ لطف یہ ہے کہ ان کے اخلاص، رواداری، بہادری اور انسانیت کے سب ہی قائل تھے۔ چوٹوں اور کانوں کا علاج ہوا، مگر دل کے زخم بھلا کیا بھرتے۔ بالکل خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے سے نکلتے، کھانے یا ناشتے کی میز پر مختصر سا ماحضر تناول کرتے۔ اور پھر اخبارات و رسائل سمیت اپنے کمرے میں جاکر لیٹ جاتے۔ ڈاکٹر سلیم الزماں بھی بہت سے پناہ گزینوں میں شامل اسی کمرے میں رہ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے ہر وقت کا ساتھ تھا مگر کوئی بات چیت نہ ہوتی تھی۔ ایک روز کہنے لگے۔

"انہیں اپنجاب کے اس بہت بڑے لیڈر سے مل کر تو بہت مایوسی ہوئی۔ ان سے جو بھی سوال کرو، معقول جواب نہیں دیتے۔ زیادہ تر ہوں ہاں کر کے ٹال دیتے ہیں۔ کتنی شہرت ان کی قابلیت اور خطابت کی تھی، مگر اب تو ایسا لگتا ہے کہ ان میں کچھ ہے ہی نہیں۔ بے کار اتنا مشہور ہو گئے تھے۔"

ٹھیک ہی تھا۔ ڈاکٹر صاحب مبہوت تھے۔ وہ اب کسی موضوع پر کسی سے بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور پھر ان سے کیوں بات کرتے جو چودھری خلیق الزماں نظریۂ پاکستان کے سب سے بڑے حامی کے چھوٹے بھائی تھے۔

وہ بہت ہی کم جواہر لال جی سے ملے، زیادہ تر گفتگو رفیع صاحب سے ہوئی اور اس عرصے میں ان ہی کے ذریعے جواہر لال جی سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم رہا۔

جلد ہی ڈاکٹر صاحب کو ایک پورا کمرہ نصیب ہوگیا۔ اور تب ان کے پاس دوستوں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا مجمع رہنے لگا۔ ان میں زیادہ تر سکھ دوستوں کے بچے تھے۔ اگرچہ ان کے والدین بہت ہی کم نظر آتے تھے۔

بات پرانی ہو گئی۔ اس لیے یاد نہیں آتا پنجاب کے بارے میں کیا ذکر تھا۔ ڈاکٹر کچلو نے آہستہ سے کچھ کہا۔ اس پر رفیع صاحب بولے۔ ڈاکٹر صاحب وہاں سکھوں

کے لیڈر آپ ہی تھے ۔ بلکہ آپ ہی نے تو ان کو منظّم کیا تھا ۔ بڑے دُکھ کے ساتھ ڈاکٹر کچلو نے اس کی تصدیق کی ۔ مگر یہ بھی کہا کہ مقصد مختلف فرقوں کا اتحاد و یک جہتی تھی ۔ کیا کیا جائے اثر اُلٹا ہو گیا ۔

کچھ عرصہ بعد پنجاب سے بھی بکثرت لوگ ان سے ملنے کے لیے آنے لگے ۔ ان میں کوئی صلاح لینے آتا ۔ کوئی مصیبت کی داستان سُنانے مگر یہ کوئی نہ کہتا کہ آپ جالندھر، امرتسر یا لدھیانہ تشریف لے چلیے ۔ نہ مسافر صاحب ہی نے کبھی یہ پیش کش کی، نہ سحرؔ صاحب نے، نہ گوپی چند بھارگوا نے ۔ عبدالغنی ڈار اور یاسین خاں خود غریب الدیار تھے ۔ کیا کہتے ۔ یہ ڈھارس بندھانے والا کوئی نہ تھا کہ آپ اپنے گھر کبھی واپس جا سکیں گے ۔ اور جائداد کے لیے لڑنا اُن کے اصول کے خلاف تھا ۔

۴۸ - ۴۹ء میں جب پناہ گزینوں کی آبادکاری شروع ہوئی، کیمپ ٹوٹ گئے، اجڑی بستیاں پھر سے آباد ہونے لگیں اور امن و امان کے لیے مسلم اور غیر مسلم والنٹیروں کی ضرورت محسوس ہوئی تو شفیق الرحمان قدوائی مرحوم کی اسکیم تعلیم و ترقی کے تحت محلوں میں اسکول اور سنٹر کھولنے کے لیے آٹھ نو غیر مسلم تعلیم یافتہ لڑکے لڑکیوں کا ایک گروپ ڈاکٹر کچلو نے پیش کر دیا ۔ یہ سلجھے ہوئے نوجوان تھے، جو کئی ماہ سے ڈاکٹر صاحب کے زیرِ تربیت تھے ۔ مگر وہ خود شرنارتھی تھے اور بغیر کسی مالی فائدے کے بہت دنوں تک امداد و بحالی کے کاموں میں لگے رہنا ان کے لیے ناممکن تھا ۔ ان سب کو بہت جلد تلاشِ روزگار اور اپنی تعلیم کی تکمیل میں منہمک ہو جانا پڑا ۔

دہلی کی ملی جلی آبادی والے علاقے ــــ پہاڑی دھیرج، قصاب پورہ، باڑہ ہندو راؤ وغیرہ کو اگلے فساد سے بچانے کے لیے ڈاکٹر کچلو بھی معاون

بن گئے۔ پہلی بار جب وہ قصاب پورہ پہنچے تو ان کا نام سنتے ہی لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ ایک صاحب نے تو یہ تک پوچھا کہ کیا یہ مسلمان ہیں؟ ہم نے تو سنا تھا کہ سکھ ہیں۔ پتہ چلا کہ اُن کے خلاف مسلم لیگ کا ایک پروپیگنڈہ یہ بھی تھا کہ مرتد ہو کر سکھ بن گئے ہیں۔

پھر پنجاب چھوڑ کر دہلی میں) ان کی آمد بھی بحث کا موضوع رہی۔ سرزمینِ مقدس پاکستان چھوڑ کر بھلا یہاں رُکنے کا کیا تک تھا۔ یہ سمجھنے میں بھی دیر لگی۔

لیکن ان کی تقریر نے لوگوں کو مطمئن کر دیا۔ جوشِ خطابت ایک بار پھر واپس آ گیا تھا۔ انسان انسانیت کی تباہی پر اپنے رنج و غم کا اظہار کر رہا تھا۔ امن و اتحاد کی تسلیم شدہ ضرورت سب کو محسوس ہوئی۔ تقریر کے خاتمے پر انتہائی عزت و احترام کے جذبات سے لوگوں نے ان کو رخصت کیا۔

محلّوں اور دیہاتوں میں دو چار بار ان کی شخصیت استعمال کرنے کے بعد ہی یہ محسوس ہوا کہ یہ ان پر ظلم ہے۔ وہ اب نہ 'گلِ نغمہ' ہیں نہ 'پردۂ ساز'۔ صرف اپنی شکست کی آواز ہیں۔ اگر ہم نے اس ٹوٹے ساز کو دوبارہ بجانے کی کوشش کی تو یہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گا۔

اور پھر رفیع صاحب نے ان کے بیوی بچّوں کو ہندستان بلانے کی کوشش کی۔ پہلے لڑکیاں آئیں۔ اور ڈاکٹر کچلو صاحب نے کہا، آپا بھی اب جلد ہی آجائے گی۔ جوں ہی مکان مل گیا وہ آجائے گی۔ ہم لوگ سمجھے ان کی کوئی بڑی بہن آنے والی ہوگی۔ کیوں کہ بار بار آپا کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ ان کی باتیں ہوتی تھیں۔

ایک محلے کے لوگوں نے کسٹوڈین کی چیرہ دستیوں سے ایک مکان کو چھڑانے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ ڈاکٹر کچلو یہ مکان اپنے نام الاٹ کرا لیں ہم خوش ہمارا خدا خوش۔

مگر ڈاکٹر صاحب نے کہا میرے بچے گلی کوچے میں رہنے کے عادی نہیں ہیں۔ وہ نہ رہ سکیں گے۔ ان کا یہ جواب کچھ ہمیں اچھا نہیں لگا، کیوں کہ اس وقت تک ہمیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کتنی جائداد اور کتنے مکانات پنجاب میں چھوڑ آئے ہیں۔

آخر کار آپا آ گئیں۔ لڑکیاں لڑکے سب اعلا تعلیم یافتہ اور پورا خاندان کھدر پوش تھا۔ اور آپا تو دوپٹہ بھی کھدر ہی کا اوڑھتی تھیں۔ بالکل پنجابی قسم کی صورت۔ آپا تو ڈاکٹر صاحب کی بیوی نکلیں اور ان سب بچوں کی ماں۔ چھ سات جوان لڑکی لڑکوں میں گھری ہوئی معصوم صفت آپا بڑا اچھا ادبی ذوق بھی رکھتی تھیں، اور غیر معمولی صبر و برداشت کا خزانہ بھی۔ کبھی رو کر انھوں نے اپنی تباہی کی داستان نہیں سنائی۔ کبھی گزارے ہوئے عیش و آرام کو یاد کر کے آہیں نہیں بھریں۔ ساری عمر کی گھر گرہستی کو یاد کرنا تو درکنار وہ اتنا بھی نہیں کہتی تھیں کہ اب زندگی کیسے بسر ہو گی۔ کیوں کہ عمر اور حالات نے ڈاکٹر صاحب کو اب بیرسٹری کے قابل بھی تو نہ چھوڑا تھا

وہ عظیم عورت جو آج بھی شوہر کی مخلص بیوی اور اولاد کی شفیق ماں تھی ہمیشہ خوش رہنے ہی کو شاید اپنا شعار بنالیا تھا۔ نہ دوستوں سے گلہ نہ دشمنوں کا شکوہ اور نہ محسنوں کی خوشامد۔ تینوں سے بے نیاز۔

تقریباً دو سال تک ایک کمرے میں زندگی گزارنے کے بعد ڈاکٹر کچلو کے لیے پنڈت نہرو نے اپنے تین مورتی ہاؤس کے قریب ایک مکان الاٹ کرا دیا۔ شاید کیونکہ وہ جواہر لال جی سے بہت دُور اس لیے نہیں رہنا چاہتے تھے کہ کبھی کبھی ان کو دیکھ لیا کریں۔ سواری اگر اپنے پاس ہوتی تو دُور رہ کر بھی یہ خواہش پوری ہو سکتی تھی۔ مگر دوسرے سے گاڑی مانگنا ان کی خودداری پر بار تھا۔ شاید اسی

لیے کہیں آمد و رفت نہ رکھی ۔ دوست احباب منہ موڑ چکے تھے اور کانگریسی حلقے بھول چکے تھے کہ یہ کبھی ہمارے لیڈر تھے ۔

آپا اُن سے زیادہ خود دار ۔ دہلی کی ادبی محفلوں میں، مذہبی جلسوں میں شرکت ضرور کرتیں مگر ہمیشہ بس سے آنا اور بس سے واپس جانا ۔ اکثر رات زیادہ ہو جاتی، مگر وہ کسی موٹر نشین کا احسان گوارا نہ کرتیں ۔ یہ دوسری بات تھی کہ کوئی مخلص دوست اُن کی تکلیف نہ دیکھ سکے اور زبردستی لفٹ دے ہی دے ۔

اب ان سے ذرا کم ہی ملاقات ہوتی ۔ لیکن جب ملتے خوش خوش، ہنستے بولتے ۔ کتابوں اور اخباروں میں گھرے ہوئے ۔ اور آپا ہمیشہ یا تو باورچی خانے میں ہوتیں یا کپڑوں کی دُھلائی میں مصروف یا گھر کی صفائی میں ۔ ایک روز فون آیا کہ بہت کم لوگوں کو بُلایا ہے ۔ آج منجھلی لڑکی کی شادی ہے ۔ تم سب ضرور آجاؤ ۔ وہاں جاکر دیکھا تو پچیس تیس آدمی جمع تھے ۔ چھوٹی سی پارٹی کا انتظام تھا صحن میں کرسیاں ڈال دی گئی تھیں اور ہلکے سے کپڑوں میں سُرخ دوپٹہ اوڑھے لڑکی اور داماد پاس پاس بیٹھے تھے نکاح ہو گیا ۔ سب نے مبارک باد دی اور چائے ناشتے کے بعد مہمان رخصت ہو گئے ۔ رفیع صاحب نے گھر آکر کہا، کتنی اچھی سادہ شادی ڈاکٹر صاحب نے کی ۔ یہی ہونا چاہیے ۔ وہ تو ہمیشہ کے سادگی پسند تھے ۔ ڈاکٹر صاحب کے ناگفتہ بہ حالات میں اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا ۔

وہ کیسے گزارہ کرتے رہے، بچّوں کی تعلیم کیوں کر ہوتی رہی، کیوں کہ دونوں لڑکے زیرِ تعلیم تھے ۔ کیا کچھ ان پر گزرتی رہی ۔ گھر سے باہر سوا انھیں دو دوستوں کے اور کسی کو علم نہ ہو سکا ۔ بیماری کے دوران میں خبر گیری کرنے والے جواہر لال جی تھے ۔ عیادت کرنے والوں سے ہنس کر ملتے ۔ فوراً آپا کو پکارتے کہ دیکھو فلاں ملنے آیا ہے ۔

مرض الموت میں بھی ان کے اطمینان و سکون میں فرق نہ آیا۔ ایک بار میں نے پوچھا کہ آپ امرتسر جائیں تو کون منع کر سکتا ہے۔ جواب دیا نہیں میں نہیں جا سکتا۔ وہ لوگ نہیں چاہتے۔

شاید کوئی اس راز سے پردہ اٹھا دے کہ وہ کیوں پھر اس سرزمین پر قدم نہ رکھ سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے تو خود طے کر لیا تھا کہ ماضی کو بھلا دیں گے۔ اس طرح کہ پھر تذکرہ بھی گوارا نہ ہوگا۔ شاید چوٹ بہت گہری تھی۔ زخم کا منھ بند نہ ہوا، مگر ان کی زبان بند ہو گئی۔

اولاد کمیونزم کی طرف چلی گئی۔ آپا کی مذہبیت اُبھر آئی اور ڈاکٹر صاحب بالکل انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ عجیب بے گانہ وشی تھی۔ زندگی کی کشتی بے پتوار کے بہہ رہی تھی۔ اور ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے اطمینان سے پڑھ رہے تھے۔

نیشنلسٹ مسلمانوں میں سے بہتیرے لوگوں کا یہی حال ہوا۔ کسی کو غم و غصے نے پاگل کر دیا۔ کوئی رجائیت و قنوطیت کے مارے دم بخود ہو گیا۔ کسی نے آستانِ حکومت پر جبہ سائی شروع کر دی اور کوئی صرف داغ ہائے سینہ کا شمار کرتا رہ گیا۔ تھوڑے ہی سے تھے جو سینہ سپر رہ سکے۔

آخر کو ہارے ہوئے لوگ تھے نا۔ اپنوں سے بھی غیروں سے بھی۔

۸۔ اجتماعِ ضدّین

بعض شخصیتیں تاریخ ساز ہوتی ہیں، بعض تاریخ کا جزو بن جاتی ہیں اور بعض تاریخ کا ایسا عنوان جس کا نفسِ مضمون سے چاہے برائے نام تعلق ہو، مگر وہ سرِ ورق پر چسپاں ہونے کی کوشش ضرور کرتی ہیں اور ناکامی کی صورت میں ماضی کی دھول بن جاتی ہیں۔ ایک بار ایسی ہی تین ہستیاں ۱۲ کنگ روڈ پر رفیع صاحب کے گھر اکٹھا ہو گئیں۔

ان میں ۱۔ دُبلے پتلے کھدّر پوش اور بزعمِ خود گاندھی جی کے سچّے بھگت تھے۔ ضرورت سے زیادہ پڑھے لکھے۔ اور غیر معمولی وہم و بے کاری کا شکار۔ انتہائی سیمابیت و بے قراری کے باوجود ان کی خوش مزاجی نے انھیں ہم سب کا دوست بنا دیا۔ جس دن وہ تشریف لائے، ڈاکٹر سلیم الزماں نے پکار کر کہا اب جگر تھام کر بیٹھو مری باری آئی۔

معلوم ہوا وہ ڈاکٹر سلیم الزماں کے علی گڑھ میں کلاس فیلو رہ چکے تھے اور وہاں ان کا استقبال اسی مصرع سے ہوا کرتا تھا۔

تنہا اور تنہائی پسند۔ انتہائی بے ضرر۔ بیوی بچوں اور خاندان سے مستغنی۔ نذا و قات و معمول کے سختی سے پابند۔ دن کے چوبیس گھنٹوں میں تقریباً چھ گھنٹے ضرور غسل خانے میں گزارتے تھے۔ ان کی مسہری پر بستر بند میں بستہ لپٹا ہوا لیٹا رہتا تھا۔

صرف دو تسمے بندھے رہتے تھے۔ رات میں جب وہ ہاتھوں کو غسل دے کر باتھ روم سے برآمد ہوتے، تو آہستہ سے چٹکی سے پکڑ کر اس ہولڈال کا منہ کھولتے اور پیروں کے راستے اس میں گھس جایا کرتے۔ پڑھتے بہت تھے۔ باتیں کم کرتے تھے یہتنی کہ سلیم صاحب کے بے تحاشا مذاق پر صرف دو ایک بار اچھل کر پھدک کر ہنستے ہوئے باہر چلے جاتے کیوں کہ جواب نہ بن پڑتا تھا۔

دنیا کے تمام مذاہب کو مانتے تھے، مگر عمل کسی پر نہیں کرتے تھے۔ میں نے پوچھا جب آپ خدا، بھگوان، گاڈ سب کو مانتے ہیں اور ان تمام مذاہب کے بانیوں کو، تو پھر کسی نہ کسی شکل میں ان میں سے کسی طریق پر بھی عمل کرتے ہوں گے۔ کہنے لگے۔ ہاں ہاں۔ ضرور بالکل۔ پھر پوچھا کس طرح؟ کہنے لگے بس گیان دھیان" سوال کیا، مگر کیسے؟ کس وقت؟ اور کہاں؟ (کیوں کہ وہ لمحہ ہمیں اب تک نظر نہ آیا تھا)۔ ڈاکٹر سلیم الزماں بے ساختہ بولے "یہ پوچھتی ہو کہاں؟ ارے بھئی غسل خانے میں" اور بات قہقہوں میں اڑ گئی۔

اکثر لوگ اس گھر میں انہیں دیکھ کر تپاک سے ان سے مصافحہ کرتے۔ اخاہ۔ آپ یہاں ہیں؟ آپ سے فلاں سن میں پیرس میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں آپ اپنے دوست فلاں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ کوئی صاحب فرماتے بھئی خوب ملاقات ہوئی۔ دس سال ہوئے، مسٹر فلاں کے یہاں آپ سے جرمنی میں ملا تھا۔ پھر پتا ہی نہ چلا کہ آپ کہاں ہیں۔ بہتیرے مہمان شکل دیکھتے ہی کہتے واہ وا کیا اتفاق ہے، رفیع صاحب سے ملنے آیا تو آپ سے بھی ملاقات ہو گئی۔ چالیس سال کے بعد آپ کو دیکھا۔ لندن میں آپ فلاں دوست کے گھر مقیم تھے۔ جب کھانے پر ملنا ہوا تھا۔ اور ہمارے جہانیاں جہاں گشت شرما کر لچک کر ہنستے ہوئے شناسائی کا اقرار کرتے مگر سننے والے سوچ میں پڑ جاتے کہ تیس چالیس سال کی تاریخ تو یہی ٹھہری کہ کسی نہ کسی ملک میں کسی نہ کسی کے

گھر میں حضرت نے وقت گزارا ہے اور شاید اپنا گھر بے چارہ ان کے قدوم میمنت لزوم سے ہمیشہ محروم ہی رہا۔

ویسے وہ اکثر لوگوں کو سیوا گرام میں بھی نظر آتے تھے اور نیشنل کانگریس کے ہر سیشن میں بھی۔ کبھی گورنمنٹ ہاؤس میں بھی ٹھہرے تھے۔ اور کسی منسٹر کے گھر بھی۔ دو بڑے مہاراجوں سے بھی ان کی رشتہ داری تھی اور مولانا آزاد سے بھی دوستی تھی۔ اپنی سیوا گرامی بہن کے قدر دان بھی تھے اور تعلیمی سنگھ والے آریہ نائکم اور آشا بہن سے بھی یارانہ تھا۔ رفیع صاحب سے بھی ملاقات تھی اور حافظ ابراہیم سے بھی۔ اور وقتاً فوقتاً وہ اپنی میزبانی کے شرف سے ان سب کو سرفراز کرتے رہتے تھے۔ مہمانوں کی بھیڑ بھاڑ کے باوجود وہ اکثر اپنے کمرے میں تنہا رہتے تھے۔ اور بہت دن رہے، مگر ایک دن حادثہ پیش آہی گیا۔

دوپہر کو کھانے کی میز پر رفیع صاحب کے بائیں ہاتھ والی کرسی پر ایک صاحب آکر متمکن ہوگئے۔ ہم میں سے کسی نے ان کو پادری سمجھا کیوں کہ وہ فراٹے سے انگریزی بول رہے تھے اور بار بار بائی گاڈ کہتے تھے۔ لیکن پھر انشاءاللہ اور ماشاءاللہ بھی کہنے لگے اب جو نظر اٹھا کے دیکھا تو پیشانی پر سجدے کا نشان کسی مولوی یا عالم ہونے کی نشان دہی کر رہا تھا۔ دُور بیٹھے ہوئے افراد نے ان کی خضاب زدہ لانبی داڑھی ہونے کی وجہ سے سکھ ہونے کا شبہ ظاہر کیا۔ مگر پگڑی سر پر نہ تھی۔ اور ڈھیلی ڈھالی شیروانی نے یہ ثابت کر دیا کہ نہ عیسائی نہ سکھ شاید مسلمان ہی ہیں۔ گفتگو کا رُخ سیاست کی طرف موڑا گیا تو جوشِ خطابت سے اندازہ ہوا شاید کوئی سیاسی لیڈر بھی ہیں۔ آواز میں بلا کی کڑک تھی۔ رفیع صاحب مسکرا مسکرا کر ہلکے ہلکے ان کی باتوں کا جواب دے رہے تھے۔ اُردو بولنا شروع کی۔ تب تو یقین ہوگیا کہ ضرور آج رفیع صاحب کا کسی مناظرہ باز مولوی سے سابقہ پڑ گیا ہے۔ بہر حال کھانے کے بعد حسبِ معمول

ان کی رہائش کا مسئلہ اُٹھا۔ان دنوں گھر کا ہر کونا مقیم اور مسافروں سے پُر تھا۔ ناچار نظرِ انتخاب ہمارے کمرے کی طرف گئی۔ بہت جز بز ہو کر اس تجویز کو انھیں منظور کرنا پڑا۔

اور تب ہمیں معلوم ہوا کہ آنے والی ہستی بھی کوئی معمولی نہ تھی۔ مجھے یاد آیا جن دنوں ہمارے باجان بجنور میں تحصیل دار تھے، ایک بورڈ سامنے کے مکان پر لگا رہتا تھا۔ اس پر لکھا تھا "ڈاکٹر محمد عمر ماہر ایکسرے"۔ ڈاکٹر صاحب ایکسرے ریڈنگ میں ماہر ہو کر ہندستان آئے تھے۔ اسکول آتے جاتے ہوئے لڑکے اس بورڈ کو پڑھتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ مگر ایک موزوں طبع لڑکے نے کہا۔ بھئی یہ مصرع اکیلا ہے کیوں نہ شعر مکمل کر دیا جائے اس نے ماہر کی "ر" کے نیچے اضافت لگائی اور چاک سے دوسرا مصرع لکھ دیا۔ اب شعر یوں تھا

ڈاکٹر محمد عمر ماہرِ ایکسرے
اُچھالی جو ٹوپی تو اُلٹے گرے

ظاہر ہے یہ بدتمیزی نا قابلِ برداشت تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے سرے سے بورڈ ہی ہٹا دیا۔

یو۔پی میں، میرا خیال ہے، قادیانیت کا سب سے بڑا علَم بردار یہی خاندان تھا۔ انھیں کے ایک بھائی ڈاکٹر زبیر سے میری ملاقات بھوالی میں ہوئی تھی۔ جہاں میں اپنی ایک عزیزہ کی علالت کے سلسلے میں بحیثیتِ تیمار دار مقیم تھی اور ڈاکٹر زبیر ٹی۔بی اکسپرٹ کی حیثیت سے ان کے معالج تھے۔

ایک دن جو شامت سوار ہوئی، میں نے غلام احمد قادیانی اور قادیانیت سے متعلق ان سے پوچھنا شروع کر دیا اور ڈاکٹر صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ چڑیا شاید پھنس رہی ہے۔ پھر تو ارشادات، ملفوظات اور تبلیغِ مذہب سے متعلق

کتنی ہی کتابیں اور رسالے انھوں نے دینا شروع کر دیے۔ وقتاً فوقتاً زبانی بھی مرزا صاحب کے داعیِ حق اور مہدی آخرالزماں ہونے کے مسئلے پر گفتگو کرتے رہے تھے۔ اپنی والی انھوں نے بہت کوشش کی مگر میں تو جیسے چکنا گھڑا تھی۔ ہر بوند مجھ پر سے پھسل گئی۔ مدتِ قیام بھی ختم ہو گئی تھی۔

بہرحال اب ان سے بڑے اور سرگرم قادیانی لیڈر کو دیکھ کر میں تو دور رہی۔ رفیع صاحب بے چارے کو دونوں وقت کھانے کی میز پر صبر و شکر سے مناظرانہ انداز، طویل گفتگو، گرجدار لہجے کا شکار بننا پڑا۔ مگر بھئی کیا ضبط و سکون تھا۔ ہوں ہاں، اچھا اور تبسم سے ان کو تسکین دے دیا کرتے تھے۔ قادیانیت کے لیے اُن دنوں سب سے سازگار سرزمین پاکستان کی تھی، جہاں مہدی موعود کے خلیفہ بھی موجود تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب کو بھی وہیں جانا تھا۔

اور پھر تیسری غیر معمولی شخصیت نے بھی اسی زمانے میں نزول فرمایا۔ ایک روز شام کو ایک بڈھی انگریز لیڈی مع سامان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئیں۔ رفیع صاحب گھر پر موجود نہ تھے۔ اور وہ صرف انھیں سے ملنا چاہتی تھیں، کیوں کہ ان کا اب یہاں مستقل قیام کا ارادہ تھا۔ حسب معمول ان کی میزبانی اور گفتگو کے فرائض ہمیں ادا کرنے پڑے۔ پہلے تو یہی پتا لگانا تھا کہ کون ہیں؟ کہاں سے آئی ہیں اور تشریف آوری کا مقصد کیا ہے۔

لیکن ہمیں زیادہ سوالات نہیں کرنے پڑے۔ انھوں نے اپنی کٹی ہوئی چھاتی دکھا کر گفتگو کا آغاز کر دیا۔ اپنا انگلش نام جو انھوں نے بتایا تھا، اس وقت بالکل میرے دھیان سے اُتر گیا۔ پٹیالہ کی خونی داستان سے شروع کر کے انھوں نے ہمیں بتایا کہ وہ اپنے دوسرے شوہر جعفر علی کے ساتھ لندن سے ہندستان آئیں اور کچھ عرصے کے بعد جب جعفر علی مر گئے یا ان سے علاحدگی ہو گئی تو وہ سادھوی دیوی بن گئیں۔

اس بیچ میں ان کے تعلقات کانگریس سوشلسٹ گروپ اور کرانتی کاریوں سے بڑھ گئے۔ جواہرلال جی اور ان کے نوجوان ساتھیوں سے بھگت سنگھ اور دوسرے انقلاب پسندوں کا میل ملاپ بلکہ اکثر نامہ و پیام ان کے ذریعے ہونے لگا اور آخر میں بھگت سنگھ اور راج گورو وغیرہ کے پھانسی پا جانے کے بعد جب مفرور چندر شیکھر آزاد الہ آباد آئے تو انھیں کے یہاں مقیم تھے۔ سی۔ آئی۔ ڈی کو پتا لگ گیا۔ آزاد جواہرلال جی ملنا چاہتے تھے۔ پیام و سلام بھی ہو چکا تھا۔ مگر یہ قید یا نظر بند کر دی گئیں۔ اتنی زبردست ناکہ بندی تھی کہ آزاد شہر سے باہر نہ نکلنے پائے۔ شہر کے کونے کونے میں مسلح پولیس بکھر گئی اور آخر کار رام باغ میں انھیں گھیر لیا گیا۔ کئی گھنٹے سخت مقابلہ رہا اور جب آزاد کے پاس گولیوں کا اسٹاک ختم ہو گیا تو پولیس انھیں زندہ نہیں مُردہ گولیوں سے چھلنی گرفتار کر سکی۔

یہ واقعہ مجھے معلوم تھا، کیوں کہ انھیں دنوں میں الہ آباد پہنچی تھی۔ مسز جعفر علی یا ساوتری دیوی کے نام سے بھی کان آشنا تھے۔ اس ملاقات سے ایک خوشی اس خیال سے بھی ہوئی کہ ذرا تفصیل سے معلومات حاصل کر سکوں گی۔

مگر نہیں وہ تو بات کرتے کرتے پھر مشرقی پنجاب اور پٹیالہ کی طرف لوٹ جاتی تھیں۔ ایک عجیب سی خود فراموشی کا عالم اُن پر طاری تھا۔ نظریں چھت پر جاتے ہوئے ۴۷ء کے پنجاب اور ریاستوں کی کہانی سنا رہی تھیں۔ ٹرینوں، کیمپوں اور گھروں پر جو آفت آئی تھی، عورتوں کی جس طرح بے عزتی ہوئی ان پر مظالم ہوئے، وہ کہہ رہی تھیں یہ سب مجھ پر ہوئے ہیں۔ غنڈوں نے مجھے یوں پکڑا، یوں ستایا، اس طرح لوٹا اور دیکھو دیکھو میری چھاتی تک کاٹ ڈالی۔ ساتھ ہی اسپتال والوں کو گالیاں دیتیں کہ ان بدمعاشوں نے مجھے ڈسچارج کر دیا ہے۔ حالاں کہ مجھے کینسر ہے۔ رفیع صاحب ہی نے تو مجھے اسپتال میں داخل کرایا تھا۔ اسی لیے میں ان کے پاس آئی ہوں۔

اکبارگی جوش میں آجاتیں۔ ہائے ہائے ٹرین الٹ دی اور آگ لگا دی۔ مجھے اور ان سب لڑکیوں کو بھی جلا دیا جنھیں میں بچا کر لا رہی تھی۔ نہ جانے ان سب کا کیا ہوا۔ میں نے ہر چند کہا کہ میں بوڑھی ہوں۔ تو بھی نہ مانے مجھے گھسیٹ لے گئے۔ اسی لیے تو بیمار ہو گئی۔ کینسر ہو گیا۔ تب میں نے رفیع صاحب کو خط لکھا۔ انھوں نے اسپتال بھیجا، علاج کرایا۔ اب میں کہیں نہ جاؤں گی۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ بوڑھی عورت اپنا دماغی توازن کھو چکی ہے۔ جو کچھ اس نے مظالم، گناہ اور صعوبتیں دیکھی ہیں، جو دوسروں پر بیتی اُسے لگتا ہے سب اس کی اپنی آپ بیتی ہے اور اسی پر گزری ہے۔ یہ واقعہ تھا کہ اس نے بہتوں کو بچانے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہی تھی۔ وہ اس بات پر روتی تھی۔ غصّہ کرتی تھی اور بار بار ہمیں یاد دلاتی تھی کہ اس نے ملک کی آزادی کی تحریک میں حصّہ لیا ہے۔ سرفروشوں کی مدد کی ہے۔ مفروروں کو پناہ دی ہے اور برٹش سرکار کی قید و بند جھیلی ہے اور مجھے کوئی نہیں جانتا ہے۔

ہمیں بہر حال انھیں جگہ دینی تھی۔ ہمارے کمرے سے ملحق ایک کوٹھری یعنی ڈرائنگ روم میں ان کا سامان پہنچا دیا گیا۔ اور اب اس اجتماعِ ضدّین کی مشکلات شروع ہوئیں۔

ڈاکٹر محمد عمر زوردار مبلغ، سخت قسم کے مسلم لیگی، زبردست مناظرہ باز اور پھر عمر ستّر سے متجاوز۔ کڑوا کریلا اور پھر نیم چڑھا۔ ہندستان سے متنفّر اور ترکِ وطن پر آمادہ تھے۔ ادھر یہ کھدر کے کرتے پاجامے اور جواہر کٹ صدری میں باپو کے چیلے اور دیش بھگت اس پر سیوا گرامی بہن کے بھائی۔ کانگریس کے ممبر بھلے ہی نہ ہوں، مگر زوردار کانگریسی۔ مذاہب سے بے گانہ مگر انسانیت کے شیدائی۔ بس کچھ نہ پوچھیے آفت آگئی۔

ڈاکٹر صاحب نے بحث و مباحثے میں ان کا ناطقہ بند کر دیا۔ مذاہب عالم پر بحث ہوتے ہوتے بات ذاتیات پر اتر آئی۔ وہ بے چارے مرنجان۔ اُلٹے ہاتھ کی تین انگلیوں سے اپنی بائیں طرف کی مونچھوں کو مستقل جھٹکا دیتے ہوئے فکرمند چہرہ لیے بار بار ٹیلی فون کے پاس چکر لگانے لگے۔ کبھی داہنے پیر پر زور دے کر کھڑے ہوتے کبھی بائیں پیر پر جھک کر نمبر ملاتے کسی سے بات کرتے۔ پھر غسل خانے میں جا کر ہاتھ دھوتے۔ پھر ڈرائنگ رُوم واپس آتے۔ پریشان پریشان کمرے اور برآمدے کا چکر لگا رہے تھے۔ بالکل جلے پیر کی بلّی بن گئے تھے۔ رات میں بھی اپنا بستر لے کر ڈرائنگ رُوم میں بھاگ آتے اور فرش پر سو رہتے۔

اُدھر ڈاکٹر صاحب گرجتے ہوئے کمرے سے نکلے ــــ یہ تو بالکل دہریہ ہے دہریہ۔ اپنا مسلم نام کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ کمال ہے۔ کس آدمی کو آپ لوگوں نے میرا پارٹنر بنا دیا ہے۔

اور پھر ساوتری دیوی یا مسز جعفر علی جو کہیے، بارہ بجے رات کو اٹھ کر ہمارے کمرے میں آ گئیں۔

ارے تم سب آرام سے سو رہے ہو۔ تمھیں نہیں معلوم مجھے مُردوں نے کتنا ستایا ہے۔ وہ لوگ برابر بول رہے ہیں۔ اُف وہ! کتنا بولتے ہیں میں سو نہیں سکتی۔ دیکھو یہ جان لو ابھی میرا کینسر پھٹنے والا ہے۔ اتنی بو ہوگی کہ تم لوگ یہاں ٹھہر نہ سکو گے۔

ایک دو دن تو ان کی بے قراری سے ہم لوگ لطف اندوز ہوتے رہے، لیکن پھر ان کی حالت پر ترس آنے لگا۔ آخر کار انھوں نے ٹیکسی بُلائی اور مع ہولڈال و سوٹ کیس کے مولانا آزاد کے گھر منتقل ہو گئے۔ کیا کیا جائے ؎

طاقت مہمانی نداشت خانہ بر مہماں گذاشت

اب نہ دو پڑوسی۔ ڈاکٹر اور میڈم۔ ڈاکٹر صاحب کو رفیع صاحب تو دن میں ایک دو بار

ہی ملتے اور کوئی نہ کوئی بکڑے ضرور مل جاتا جس سے دل کا غبار نکال لیتے تھے۔ رفیع صاحب تو ان کی زوردار آواز، قابلانہ لہجے کسی سے بھی متاثر نہ ہوتے تھے۔ بس اپنے والد کے ملنے والے کا احترام تھا کہ خوردی کا انداز قائم رکھتے ہوئے دو چار تشفی بخش جملے اور مسکراہٹ سے ان کی دل جمعی کر دیا کرتے تھے۔ بہت جلدی کی گئی جب بھی ایک ہفتہ جہاز کی سیٹ ملنے میں لگ ہی گیا اور تب وہ پاکستان سدھار گئے۔ ان دونوں کے جاتے ہی ایسا لگا کہ کانفرنس ختم ہو گئی۔ محفل برخاست ہو گئی اور دو نسلیں ہوائیں اُڑ گئیں۔

اب رہیں میڈم۔ تو وہ مَردوں سے، داڑھی سے اور باہر نکلنے سے متنفّر تھیں۔ وہ اکثر ہمارے پاس آجاتیں۔ ہم کو معلوم ہو چکا تھا کہ ایک چھاتی کینسر کے آپریشن کی نذر ہو چکی ہے۔ مگر مرض ختم نہیں ہوا ہے۔ لیکن وہ ہمیں یہی یقین دلاتی رہتیں کہ فسادات میں ان کی یہ درگت بنی ہے ان ناگوار واقعات کا اثر آپ بیتی بن کر ان کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا، جو انھیں چین سے سونے نہ دیتا تھا۔ انھیں وہ عورتیں یاد آتیں، جن کو بچا کر وہ لا رہی تھیں! اور حادثے کا شکار ہو گئیں لیکن اس گھر میں بچّے تھے، نوعمر لڑکے اور لڑکیاں تھیں اور ہمیں ان کی حفاظت کے خیال سے رفیع بھائی سے کہنا پڑا کہ ان کو پھر اسپتال پہنچا دیا جائے۔

وہ دوبارہ اسپتال میں داخل ہوئیں اور کچھ ہی عرصے بعد ہمارے پاس پھر فون آیا کہ میں اب ٹھیک ہوں اور آرہی ہوں۔ اب تم سب کے ساتھ رہوں گی۔ اس بار ہمیں پُرزور احتجاج کرنا پڑا کہ انھیں یہاں نہ آنے دیجیے۔ کہیں اور ان کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دیجیے، کیوں کہ اب وہ آخری اسٹیج سے گزر رہی ہیں اور بچّوں کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا ہے۔ انتظام ہو گیا۔ اور وہاں انھوں نے آرام سے زندگی کے آخری دن کب پورے کیے؟ ہمیں کچھ عرصے بعد خبر ملی۔

اب جن کے دیکھنے کو...

یہ تین تھے جن کے دماغ پر سیاست سوار تھی ۔ مذہب کھیلے میں تھا۔ انسانیت اونچی نیچی ہوا کرتی تھی ۔ وہ ایک دوسرے کو برداشت نہ کرسکتے تھے۔ مگر تینوں اپنے کو برداشت کرنے والا ڈھونڈھتے ہوئے اس شخص کے پاس آئے تھے جو بزرگوں کا احترام کرسکے، دیش بھگتوں کی قدر کرسکے اور کرانتی کاریوں کی مدد کرنے والا ہو۔ اور ان دنوں سوائے رفیع صاحب اور جواہر لال جی کے اور کون تھا جو انھیں پہچانتا۔

۹- مِردُولا سارابھائیؑ

مردولا سارابھائی۔ میری عزیز ترین دوست، ۲۷ سال کی ساتھی، ہر کام، دُکھ اور پریشانی کی شریک، ۲۷ اکتوبر ۷۴ء کو اس دُنیا سے رخصت ہوگئی۔ یادوں کے اس قبرستان میں ایک نئی قبر کا اضافہ ہوگیا۔ روز ہی بقولِ مولانا رُومؒ کوئی نہ کوئی شاخ معطل کر دی جاتی ہے۔ اور ؎

از عدم ہا سوئے ہستی ہر زماں
ہست یارب کارواں در کارواں

آنے جانے کا سلسلہ جاری ہے لیکن کچھ ایسی ہستیاں بھی اس دنیا میں آئی ہیں جنھیں جاننے والے بھی بعض اوقات اجنبی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں اور نہ سمجھنے والے تو ہر وقت ان کی طرف سے مشکوک و مشتبہ رہتے ہیں۔

ایسی ہی ایک شخصیت مردولا بہن کی تھی۔ اوپر سے پتّھر کی طرح سخت اندر سے موم کی مانند ملائم۔ کبھی کبھار تو اس لوہے کو پگھلانے کے لیے پوری بھٹّی جلانے کی ضرورت پڑتی۔ اور کبھی محض معمولی حرارت سے دریا رواں ہوجاتا۔

ساری زندگی محنت و جفاکشی میں گزری۔ بہت چھوٹی عمر سے کانگریس تحریک میں شریک ہوگئیں۔ ستیاگرہ کی۔ کتنی ہی بار جیل گئیں۔ آشرم میں رہیں۔ عدم تشدد اور سچائی کو انھوں نے پکّے مذہبی عقیدے کی طرح اپنایا تھا۔ آزادی کی تحریک

میں دامے درمے قدمے حصّہ لیا۔ مگر فریڈم فائٹر ہوتے ہوئے بھی کانگریس سے نکال دی گئیں۔ حکومت نے ان کو غدّار سمجھا، اور ان سب نے بھی جو برسرِ اقتدار گروہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا سوشل بائیکاٹ کیا۔ بقولِ اقبال ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا،
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

مگر اس پہاڑ کی پیشانی پر شکن نہ آئی۔ انھوں نے وہ کہا جو ٹھیک سمجھا اور وہ کیا جس کی ضمیر نے اجازت دی۔

پھر بھی ساری زندگی کانگریسی رہیں۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا ممبرشپ یا عہدے سے کوئی کانگریسی نہیں بن سکتا اور جو ایک بار گاندھی جی کی آئیڈیالوجی کو اپنا چکا اسے نہ بدلا جاسکتا ہے، نہ نکالا جاسکتا ہے۔ اس لیے وہ کانگریسی ہیں، کانگریسی رہیں گی۔

وہ غدّار تھیں یا دیش بھگت؟ اس کا فیصلہ اب ہمارا ضمیر کرے گا۔ اور وقت تو پہلے ہی بتا چکا۔ دولت کی ریل پیل میں آنکھیں کھولیں۔ سات بھائی بہنوں کی بڑی بہن اور والدین کی چھیٹی اولاد ہونے کے ناتے قومی خدمت کے لیے ان کو بھرپور مواقع تھے۔ دونوں ہاتھوں سے روپیا لٹاتی تھیں۔ مگر اپنی سادہ زندگی میں فرق نہ آنے دیا۔ میوا گرام کا گہرا اثر رہن سہن پر ہمیشہ قائم رہا۔

کھدّر کے دوجیبوں والے کرتے، کٹے ہوئے بال، پیشاوری چپل اور شلوار والی مردولا کو بھائی بہن "باس" کہتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض وقت ان کے والد انبالال سارا بھائی بھی ہنس کر انھیں 'باس' کہہ دیا کرتے تھے۔ ساتھی انھیں 'پٹھان' کہتے اور لوگ طنزاً 'امر داللہ' بھی کہا کرتے تھے۔ اور آخری دَور میں تو ایسے ایسے خطابوں سے نوازی گئیں کہ سُن کر خون کھول جاتا تھا۔ وہ سُنتیں، پڑھتیں، مگر بالکل بمبئی والوں

کے لہجے میں یہ کہہ کر ٹال جاتیں "ایسا ہی چلتا ہے"۔ "اِس دُنیا میں یہی ہوتا ہے"۔
نام تو برسوں سے سُن رکھا تھا مگر ملاقات ۴۷ء کے آخر میں پہلی بار ہوئی۔
اور پھر تعلقات بڑھتے گئے۔ پناہ گزینوں کے کیمپ میں۔ شرنارتھیوں کے خیموں میں،
پنڈت نہرو کے گھر پر، رفیع بھائی کے سنٹرل سکریٹریٹ کے کمرے اور گورنمنٹ ہاؤس
سے لے کر گندے کمروں تک مردولا سارا بھائی کی تگ و دو اور بھاگ دوڑ کا تماشا
دیکھتی رہی۔ بے دھڑک پاکستان ہائی کمیشن میں گھس جاتیں۔ ہندستانی اور پاکستانی
ملٹری افسروں سے جھگڑ بیٹھتیں۔ ایک پیر پنجاب میں تھا تو دوسرا دہلی میں کبھی پاکستان
کے وزیر اعظم سے گفتگو ہو رہی ہے، تو کبھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے۔
ان کی عجیب و غریب شخصیت، مردانہ وار جد وجہد اور بے دریغ مالی امداد
نے شانتی دل کو جنم دیا۔ جس کے سیکڑوں ورکر مارے فساد زدہ علاقے اور
کشمیر تک پھیل گئے۔ کارکن عورتوں، نوجوان تعلیم یافتہ لڑکیوں کی ایک فوج تیار ہوگئی
جنھوں نے کیمپ، آشرم، اسکول، آفس سب جگہ گھس کر امن و امان بحال
کرنے میں ہاتھ بٹایا۔
مردولا کانگریس کی جنرل سکریٹری رہ چکی تھیں۔ گاندھی جی کی خاص میسنجر بن
چکی تھیں۔ جیوتی سنگھ کی بانی تھیں۔ احمد آباد میں مہیلا کانگریس والنٹیر کور کی
آرگنائزر تھیں۔ کستوربا ٹرسٹ، تعلیمی سنگھ، سَرو دے سمیتی، گاندھی پیس فاؤنڈیشن
سب سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ ٹھکر باپا کی چہیتی بیٹی تھیں اور پنڈت نہرو کی مخلص دوست۔
لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی سرکردگی میں جب ری کوری آرگنائزیشن کا قیام ہوا تو
اس کی اصلی کرتا دھرتا مردولا ہی تھیں۔
یہ صرف مردولا کی حکمت تھی کہ انتیس ہزار اغوا شدہ عورتیں پاکستان سے برآمد
کرلیں اور اس سے کچھ زیادہ ہی وہاں بھجوا دیں۔ اگر یہ پٹھان عورت نہ جاتی تو سُرخ پوش

لیڈر رفیقہ اخان کو ساتھ لے کر..... نواب کے گھر سے ستائیس ہندو لڑکیاں نکال لانے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

شانتی دَل میں پکا انفارمیشن آفس مردولا نے قائم کر رکھا تھا۔ کانسٹی ٹیوشن ہاؤس کے چار کمروں میں ان کی اپنی رہائش اور آفس سب کچھ تھا۔ روزانہ ورکر کشمیر، پنجاب اور دہلی کے دیہاتوں سے رپورٹیں لاتے جو باقاعدہ انگریزی میں ٹائپ ہو کر رات میں پنڈت نہرو کے پاس پہنچ جاتیں اور فوری کارروائی جلد سے جلد ہو جاتی۔

دلّی، پنجاب، بارہ مولا، پونچھ، ہر جگہ مصیبت زدوں کی امداد کے لیے حکومت کا اثر و رسوخ اور امداد پہنچ رہی تھی۔ اور ہر جگہ ہمارے ساتھی مصروفِ عمل اور مردولا سارابھائی کی ہدایت کے منتظر رہتے۔

کیا کچھ بتاؤں اور کیسے گناؤں اُن کاموں کو جو مردولا نے اپنے ملک کی محبت میں کیے۔ انھوں نے جو سوچا قوم کے لیے سوچا، جو قدم اٹھائے انسانیت کی بھلائی کے لیے اٹھائے، انسان کی عزت و آبرو کو اپنی ذات سے زیادہ مقدس سمجھا۔ رفیع بھائی کے بعد صرف مردولا کا دسترخوان تھا، جس پر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب ایک ساتھ کھاتے پیتے نظر آتے تھے۔ صرف وہ ایک گھر تھا جو ہر ضرورت مند کی رہائش کے لیے کھلا ہوا تھا۔ وہ ایک ذات تھی جس سے مدد مانگنے اور صلاح لینے گجراتی، مراٹھی، افریقی، افغانی، بنگالی اور کشمیری طالب علم بے تکلف آیا کرتے تھے۔

ایک ایسا زمانہ بھی آیا جب وہ اکیلی رہ گئیں۔ جیل بھی ایک سال کی کاٹ لی اور نظر بندی کی مصیبت بھی بھوگ لی، اور یہ سب ہندستان آزاد ہونے کے بعد۔ انھوں نے جیل سے بھی مجھے خط لکھا اور نظر بندی کے دنوں میں ایک بہانے سے جا کر میں نے چند دن ان کے ساتھ بھی گزارے، مگر پائے استقلال میں جنبش نہ دیکھی۔ اور پھر

کل کے باغی آج جب گفتگو کے قابل اور ملاقات کے اہل سمجھے گئے، جب کشمیر کے سب قیدی چھُٹ کر اپنے گھروں کو چلے گئے اور جب وہ خود اپنے بال بچوں کی ذمہ داری سنبھالنے کے قابل ہوگئے تو مردولا نے کہا میرا کام ختم۔ میں کشمیریوں کو انصاف دلانا چاہتی تھی، سو ہوگیا۔ اب میرا کیا مطلب۔ وہ جانیں ان کا کام جانے۔

دیہاتی عورتوں کی ٹریننگ کی اسکیم ان کی تھی۔ بال سہیوگ کا خاکہ ان کا تیار کیا ہوا تھا۔ اور ہندستان میں باقی رہ جانے والی مسلم لڑکیوں کے لیے 'ویمن سروس ہوم' کا قیام ان کا مرہونِ منت تھا۔ مگر جب کوئی چیز چالو ہوگئی، جب کوئی ادارہ بن گیا تو ہمیشہ انھوں نے اس سے اپنا ناتا توڑ کر سہرا اپنے ساتھیوں کے سر باندھ دیا۔

اپنی خدمات کا کوئی صلہ نہ انھوں نے پبلک سے مانگا نہ حکومت سے، نہ خدا سے، سب ان سے خفا ہوگئے۔ مگر ان کو نہ کسی سے شکوہ تھا نہ شکایت۔ ان کا خیال تھا، دُنیا میں یہی ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی فکر نہ کرنی چاہیے، اپنی ڈیوٹی اپنا فرض انجام دیتے رہنا چاہیے۔

بہت دنوں سے بستر پر سیدھی لیٹ نہ سکتی تھیں۔ اس لیے بڈ اسٹینڈ لگا رکھا تھا جس پر ٹیک لگاکر آدھا دھڑ بستر پر دراز کرلیتی تھیں۔ لنگڑا کر چلتی تھیں اور ایک چمڑے کی پٹی باندھ کر گھر سے باہر نکلتی تھیں۔ ڈاکٹر کہتے کمر اور گھٹنوں کی ہڈیاں بڑھ گئی ہیں جنھوں نے نشست و برخاست پر اثر ڈالا۔ کتنی ہی بار میں ان سے جھگڑتی، آخر اس حالت میں کیوں کہیں جاتی ہیں۔ کیوں کام کرتی ہیں۔ کیوں دوسروں کے لیے اتنی فکر کرتی اور اپنی عمر سے لاپروائی برتتی ہیں۔

لیکن ان کو تو بیماری کے ابتدائی ہفتے تک میٹنگ اٹنڈ کرنا تھی خط لکھانے تھے۔ اخبارات کی کٹنگ دیکھنی تھی، طالب علموں کی مدد اور بیماروں کی عیادت کرنی تھی۔ بیسیوں فون کرنے اور کرانے تھے۔ اور بمشکل اُبلی ہوئی ترکاری حلق سے

اتارتی تھیں۔ ان کے پاس وقت کم تھا اور کام بہت سارے۔ صرف نو دن بستر پر پڑیں۔ اور حتی الامکان اپنی ڈیوٹی پوری کی۔ اگر کسی نے کبھی یاد دلایا کہ آپ نے فلاں کے لیے یہ کیا اور اس نے یہ بدلہ دیا، تو بُرا مان جاتیں۔ وہ صاف مُکر جاتی تھیں کہ انھوں نے اس شخص کے لیے کچھ کیا ہے۔ جو کچھ کیا، ایمان داری کے لیے کیا یا انصاف کی خاطر کیا یا اپنے ملک کی محبت میں کیا یا انسانیت کی بھلائی اور امن وامان کے لیے کیا۔ ایسے جواب سُن کر کہنے والا شرمندہ ہو جاتا۔

ایک معمولی سی لڑکی کو اس کے والدین تک دوسرے ملک بھیجنے کے لیے انھیں دو ہزار روپیہ صرف کر دینے میں بھی تامّل نہ ہوتا۔

دوستوں کے دُکھ درد میں شرکت ضروری تھی۔ ان لوگوں کا حق بھی ان کو تسلیم تھا جنھیں ملک، حکومت یا سوسائٹی بھول چکی ہو یا ٹھکرا چکی ہو، مگر اپنی زندگی کے کسی مرحلے میں انھوں نے جنگِ آزادی میں حصّہ لیا تھا۔

اپنے بھائی وکرم سارابھائی کی موت کے بعد وہ اتنی دل شکستہ اور بے زار سی نظر آنے لگی تھیں کہ مجھے لگتا تھا جیسے طویل سفر کی تیاری کر رہی ہیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے کہا تھا، "مردولا تم خدا کے لیے میرا ساتھ نہ چھوڑ دینا۔ مجھے اس وقت سے ڈر لگتا ہے جب انسان دوستوں کے بغیر تنہا رہ جائے۔" لیکن وہی ہوا۔ خدا کی مرضی۔

مردولا ٹھیٹھ ہندستانی تھیں، مگر ان کا دماغ بیسویں صدی کا سائنٹفک دماغ تھا۔ ہند وکلچر مگر فراخ دلی کا یہ عالم کہ گھر کا ہر گوشہ مذاہبِ عالم کی عبادت کے لیے کھلا ہوا تھا۔ ہر مذہب کی رُوح اُن کے اندر تھی، مگر ان کا خود مذہب کیا تھا، مجھے نہیں معلوم۔

کسی نے کہا مردولا ایک انسٹی ٹیوشن تھیں، کسی نے ان کو دیش بھگت بتایا،

کسی نے ان کو فریڈم فائٹر تسلیم کیا اور کسی کو ان کا دلیری، بہادری، اصولِ انصاف اور سچائی کے لیے لڑنا یاد آیا۔ لیکن کسی نے یہ نہ کہا کہ کاش ہم بھی ویسے ہی غدّار ہوتے جو بہت سے خود ساختہ دیش بھگتوں کی دیش بھگتی سے اس ملک کو بچا سکتے۔ خدا اُسے اس کی نیکیوں کا اجر عطا فرمائے اور حشر میں کہہ دے:

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

۱۰- جواہرلال نہرو

یادش بخیر ۲۰ء کا کوئی مہینہ تھا جب بارہ بنکی میں بدیسی کپڑوں کی ہولی جلانے کا اعلان ہوا۔ گانو گانو سے لوگ کپڑوں کے بکس اور گٹھریاں پوٹلیاں بیل گاڑیوں اور یکوں پر لاد کر ضلع کے صدر مقام پر پہنچے۔ ایک بہت بڑے میدان میں رنگ برنگے جھم جھماتے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ گوٹہ کناری، سلمہ اور زردوزی کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ میں بھی اپنی ماں کی پُرنم آنکھیں اور دادا کا لال پیلا چہرہ دیکھتی ہوئی اپنے گانو سے بارہ بنکی پہنچی۔ انھیں زیادہ غصہ اس پر تھا کہ میرا اور شفیع صاحب کا شادی کا جوڑا بھی جلنے والے کپڑوں میں شامل تھا۔
میدان کے سرے پر اسٹیج کے قریب کثیر مجمع تھا اور قناتوں سے گھرے ہوئے ایک خیمے میں ہم بہت سی عورتیں جمع تھیں۔ ان میں ضلع کے معزز ٹھاکر صاحبان کے گھرانوں کی خواتین بھی تھیں۔ اور ہم سب جواہرلال جی کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔

ذرا دیر بعد تالیوں کا شور ہوا۔ گاندھی جی کی جے جواہرلال نہرو کی جے انقلاب زندہ باد کے نعروں کے درمیان خوبصورت، شگفتہ مسکراتے ہوئے جواہرلال جی نظر آئے۔ اسٹیج پر مقامی لوگوں کے علاوہ چودھری خلیق الزماں اور گوکرن ناتھ مصرا بھی تھے، لیکن مجمع کی نظریں صرف اُس اُبھرتی ہوئی قیادت پر مرکوز تھیں جو آگے چل کر

ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والی تھی۔

اندر کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ بڑے باپ کا بیٹا ہے اشرفیوں میں کھیلتا ہے کسی نے کہا ارے ان کے تو کپڑے تک پیرس میں دُھلتے تھے اور آج دیکھو موٹے کھدر کی شیروانی ٹوپی پہنے ہیں۔ کسی نے معلومات کا ذخیرہ لٹایا۔ ان کے گھر کا جو سامان جلایا گیا ہے اس کی تھاہ نہیں۔ اکیلی قمیصیں سات سو کی تعداد میں جلائی گئی ہیں سات سو۔ بڑھیوں نے نعرہ لگایا، دھن بھاگ اُس ماں کے جس نے ایسے سپوت کو جنم دیا۔

جواہر لال جی کا نام تو بہت سُن رکھا تھا۔ اخبارات میں موتی لال جی کی اور ان کی تقریریں بھی پڑھتی رہی تھی، مگر دیکھا آج پہلی بار۔

گانو میں قیام کی وجہ سے پھر کئی سال کسی جلسے میں شرکت کا اتفاق نہ ہوا۔ جواہر لال جی اُس وقت تک صرف ایک بڑے باپ کے بیٹے تھے اور نوجوانوں کے لیڈر۔ زیادہ تر بڑے شہروں میں اُن کا آنا جانا رہتا، لکھنؤ تو برابر ہی آیا کرتے تھے۔

کسی کیس کے سلسلے میں اس سے دو ایک سال پہلے اپنے باپ موتی لال نہرو کے ساتھ بارہ بنکی بھی آئے تھے۔ نئے نئے بیرسٹر ہو کر آئے تھے، اس لیے جونیر وکیل کی حیثیت سے ساتھ تھے، قیام ان دنوں ہمیشہ ڈالی باغ لکھنؤ میں محمد نسیم صاحب ایڈوکیٹ کے یہاں ہوا کرتا تھا۔

ایک روز نسیم صاحب نے پوچھا کہیے پنڈت جی آپ کا اپنے بیٹے کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا وہ بھی آپ کی طرح لائر کی حیثیت سے نام پیدا کرے گا موتی لال جی کچھ سوچ کر کہنے لگے، میرا بیٹا ممکن ہے مشہور بیرسٹر نہ بن سکے لیکن مجھے یقین ہے وہ بڑا آدمی ضرور بنے گا۔ کتنا صحیح اندازہ تھا باپ کا اپنے بیٹے سے متعلق۔

قومی تحریک شروع ہوئی اور جواہر لال جی نے بیرسٹری تیاگ کر ہمہ تن ستیاگرہ میں شرکت کر لی۔ اس دن بارہ بنکی میں جلسے میں ان کی تیز شعلہ بار آنکھیں، آتشیں

تقریر اور فلک شگاف نعروں نے ایسا مبہوت کر دیا کہ ہم سب ایک بے چینی اور تڑپ لے کر جلسے سے رخصت ہوئے تھے۔

ضلع میں ہنگامہ خیز دور شروع ہو گیا۔ دار و گیر کا دور گزر کر جب قیدی چھوٹے اور نسبتاً سکون ہوا تو چند سال بعد انھیں بار بار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ لکھنؤ، الہ آباد، دہرہ دون ہر جگہ، مگر دور سے۔ ۱۹۴۵ء میں دہرہ دون میں جب وہ آخری بار قید سے رہا ہوئے، تو شفیع صاحب جیل کے دروازے پر اُن کے منتظر تھے اور انھیں سیدھے اپنے گھر لے آئے۔ پنڈت جی کے ساتھ پوری بارات تھی۔ دوستوں کے ساتھ چائے پیتے پیتے انھیں خیال آیا، بولے شفیع ڈرائیوروں کو بھی چائے ناشتہ کرا دو۔ انھیں بتایا گیا کہ یہ سب ہو چکا ہے۔ بہت خوش ہوئے پھر ہم سب سے ملنے اندر آئے۔ توفیق کو گود میں بٹھایا بچیوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میرے اس سوال پر کہ اب تو آپ جیل نہ جائیں گے، ہنسے اور کہا پتا نہیں۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر الہ آباد یا لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

۱۹۴۷ء سے دہلی میں بار بار اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ کبھی شکوہ شکایت کرتے، کبھی شکر یہ ادا کرنے کبھی جھگڑا کرنے بیسیوں بار گئی۔ غم و غصے کے بوجھ سے گراں بار جاتی تھی اور زیادہ تر مطمئن و مسرور واپس آتی تھی۔

ہمارے گھر سب انھیں پنڈت جی کہتے تھے۔ ۱۹۱۹ء سے ان کا تذکرہ ہوتا ہی رہتا تھا جن دنوں ہم لوگ الہ آباد میں تھے، رفیع بھائی سوراج بھون میں رہا کرتے تھے۔ اُن دنوں پنڈت جی الہ آباد میونسپل بورڈ کے چیرمین ہو گئے تھے۔ انھوں نے شفیع صاحب کو بھی بُلا لیا تھا۔ ایک مولوی صاحب کو میں نے بچوں کے پڑھانے کے لیے مقرر کیا۔ مولوی صاحب فخریہ کہا کرتے تھے کہ جواہر لال میرا شاگرد ہے۔ میں نے اسے فارسی پڑھائی ہے۔ جلیبی کھانے کا بڑا شوقین تھا، اس لیے روز اس کے لیے تازی جلیبیاں آتی تھیں۔

وہ کیا کھاتے، بچپن میں کیسے رہتے تھے، کس عیش و آرام میں پلے تھے۔ عوام کو ان سب کی کرید لگی رہتی تھی۔ اور اسی لیے جب سائمن کمیشن کی آمد پر یہ خبر سُنی کہ اُن پر لاٹھیاں تک برسی ہیں تو بچے تک رو رہے تھے کہ ہائے اتنے اچھے جواہر لال جی کو کتنی چوٹ آئی ہوگی۔ (تب تک وہ چاچا نہرو نہیں بنے تھے)

لال قلعے میں آزاد ہند فوج کے سورماؤں کا مشہور تاریخی مقدمہ تو دہلی میں ہو رہا تھا اور ہندستان کے کونے کونے میں اس ظلم و نا انصافی کے خلاف پنڈت جی کی آتش بیانیاں برٹش حکومت کے خلاف باغیانہ جذبات پیدا کر رہی تھیں۔

مجھے یاد ہے۔ دہلی میں ایشین ریلیشن کانفرنس ہو رہی تھی مختلف ملکوں کے ڈیلی گیٹ پنڈال میں موجود تھے۔ کھُلے اجلاس میں ریلا جو آیا، دھکا پیل شروع ہو گئی۔ آگے جانے کے لیے کش مکش تھی . . . . . پنڈت جی کے قریب ہی شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم بیٹھے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ پنڈت جی پہلے تو مجمع کو ناگواری سے گھورتے رہے، دو تین بار غصّے میں ہمکے۔ اور پھر کود کر مجمع میں پہنچ گئے۔ دھپا دھپ لوگوں کے کاندھے پر ہاتھ مارنا شروع کر دیے۔ شفیق صاحب حیران کہ یا اللہ ان کو کیا ہو گیا ہے۔ مار پیٹ پر اُتر آئے ہیں۔ مگر جس کاندھے پر ہاتھ پڑا وہ نیچے بیٹھ گیا۔ یوں سب کو بٹھا کر پھر اپنی جگہ واپس آ گئے۔

اپنی ابتدائی زندگی میں پنڈت جی شعلۂ جوّالہ تھے، مگر جنگ آزادی میں پک ہوئے تو حیرت ہوتی تھی اتنے صلح جو کیسے ہو گئے۔ کیسے دوسروں کی بدتمیزیاں اور خود غرضیاں برداشت کر لیتے تھے۔ بادشاہوں جیسی متلوّن مزاجی رکھتے ہوئے اور بورژوائی ماحول کے پروردہ ہوتے ہوئے ایسے مستقل مزاج جمہوریت پسند کیسے ہو گئے؟

ابتدائی دَور کی فضول خرچیوں اور عیش پسندیوں کو کوئی مناسبت بعد

کی سادگی اور بے تکلفی سے باقی نہ رہی تھی۔
یا تو بیوی سے روز کا جھگڑا تھا، یا دُنیا جہان کی عورتوں کے بکھیڑے اور حماقتیں سننے کی طاقت عطا ہوگئی تھی۔ اپنی ایک بچّی اندرا تو باپ کی شفقت سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہو پائی اور سارے دیس کے بچّے ان کو محبوب ہو گئے۔ وہ سب کے چاچا نہرو بن گئے۔
یہ ساری تبدیلیاں لانے والی ہستی گاندھی جی کی تھی، ان کی صحبت نے کا یا پلٹ دی۔ گاندھی جی میکدہ ساز تھے، میکدہ بردوش نہیں۔ انھوں نے جنگِ آزادی کے لیے بہت سے سپاہی تیار کیے "قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری" اور اس جواہر کو پرکھ کر انھوں نے سپہ سالارِ اعظم بنا دیا۔
ملک کے سربراہ بنتے ہی ان کے جواں عزائم، دیس کی تعمیر، ترقی اور تنظیم کے لیے انقلابی قدم اٹھانے کو مچل رہے تھے۔ انھوں نے طوفانی دَورے کیے ہندستان ان کے لیے اجنبی نہ تھا۔ تفریحًا اور سیر سپاٹے کے شوق میں پہلے ہی دُشوار گزار مقامات تک جا چکے تھے اور اب تو ہر چیز کو نئی بنانا، سنوارنا اور آزادی کو محفوظ و استوار رکھنا تھا۔
لیکن ہندستان آزاد کیا ہوا، سر منڈاتے ہی اولے پڑنا شروع ہو گئے اور اس وقت امن و امان کی کوشش میں وہ کسی معمولی ورکر سے کم نہ تھے۔ ۱۹۴۷ء کے آخر میں دلّی کے کسی راستے سے گزرے تو دیکھا کہ دو لڑکیاں غنڈوں کے نرغے میں پھنسی ہوئی چیخ رہی ہیں۔ فوراً موٹر رکوائی۔ ڈرائیور پریشان، سکیورٹی والے نروس دیکھتے ہی رہ گئے۔ اور پنڈت جی نے تیزی سے اُتر کر ایک کے ہاتھ سے بندوق چھینی دوسرے سے لڑکیوں کو تھاما اور موٹر میں واپس آ گئے۔ غنڈے بھی اس تنہا آدمی کو پہچان کر اور اس کی جرأت و ہمّت دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے۔

ایک روز انھیں خبر ملی کہ جامعہ ملّیہ اغیار کے محاصرے میں ہے۔ منٹوں میں خود پہنچ گئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملے حالات کا پتا لگایا اور حفاظت کے مؤثر انتظامات کر کے واپس ہو گئے۔

حق و صداقت کی آواز گولیوں سے مہر بہ لب نہیں ہوئی۔ اس نے کردار و عمل کا رُوپ پنڈت جی کی شکل میں دھار لیا تھا۔

مجھے یاد ہے دلّی کے گرد و نواح میں ایک اہم واقعہ ہوا تھا۔ رفیع صاحب نے کہا پنڈت جی کو لکھ دو۔ لکھا، پھر بھیجنے کی ہمت نہ پڑی۔ واقعہ حکام کی نظر میں زیادہ اہم نہ تھا۔ لیکن ہم سب کارکن بہت پریشان تھے۔ رفیع صاحب نے کہا اچھا اچھا خود مل کر بتا دو مِتھائی سے وقت لے کر ملنے گئی تو نہ جانے کیوں سکریٹری نے مجھے گھنٹوں بٹھال رکھا۔ اس بیچ آٹھ بج گئے اور موٹروں پر موٹریں آنی شروع ہوگئیں۔ میں نے پوچھا کوئی خاص بات ہے۔ کہنے لگا ڈنر ہے۔ یہ سُن کر طبیعت بہت جھلّائی۔ ایک چھوٹا سا پُرزہ لکھ کر میں نے سکریٹری کو دیا کہ اسے پنڈت جی کے سامنے پیش کر دینا میں جا رہی ہوں۔ کہنے لگا یہ تو اُردو میں ہے۔ میں نے کہا جو بھی ہے تم بے فکر رہو۔ وہ پڑھ لیں گے۔ دوسرے ہی دن صبح فون آیا کہ آپ کو بُلا رہے ہیں۔ گئی تو کہنے لگے بھئی معاف کرنا۔ کل تمھیں بہت انتظار کرنا پڑا۔ مجھے بتایا ہی نہ گیا تھا ورنہ اُسی وقت بلا لیتا۔ مفصّل رُوداد سُنی اور ہم سب مطمئن ہو گئے۔

دلّی کے خانماں بربادوں اور اُجڑے دیہاتوں کی از سرِ نو آبادکاری کا سوال اُٹھا تو سیدھے جا کر وہی دروازہ کھٹکھٹایا کسی سعی و سفارش کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

جبل پور کے ہنگامے کو سُن کر وہاں جاتے ہوئے راستے ہی سے ہم نے خط لکھ دیا کہ ہم دونوں (سبھدرا جوشی اور میں) وہاں کے خوفناک حالات سُن کر جا رہے ہیں ہمیں آپ کی اخلاقی مدد کی ضرورت ہے۔ ہم ضرورت پڑنے پر آپ کا نام استعمال کریں گے۔

انکار نہ کر دیجیے گا۔ آپ کے نمائندے اور ایلچی کی حیثیت ہمیں حاصل ہونا چاہیے۔ اور پنڈت جی نے ہماری لاج رکھ لی۔ مرتے مرگئے مگر یہ نہ بتایا کہ مجھ سے بغیر ملے یا بلا اجازت گئی تھیں۔ بلکہ ہر ہر قدم پر ہماری مدد کی۔

دو بار اُن کے شدید غصّے کا بھی مجھے نشانہ بننا پڑا۔ تعلیم و ترقی کی بلڈنگ والے معاملے میں تو خیر بیگم زیدی بھی ساتھ تھیں، مگر دوسری بار کنگ آف ماچس والا کی بیگم کو لے کر جب پہنچی تو اتنی احتیاط کی تھی کہ مسٹر شیو پرشاد سنہا وکیل سے پورا کیس لکھوا کر لے کر گئی تھی۔ وہ لوگ مہینوں سے کوشش کر رہے تھے، مگر سکریٹریٹ میں نہ جانے کیوں کوئی نہ چاہتا تھا کہ پنڈت جی سے ان کی ملاقات ہو۔ خود پرائیوٹ سکریٹری تک مخالف تھے۔ میری وجہ سے وقت تو مل گیا، مگر خوب کان بھرے جا چکے تھے۔ ہماری صورت دیکھتے ہی پنڈت جی برس پڑے۔ غصّے کی انتہا نہ تھی۔ یہاں تک کہہ ڈالا کہ مجھے اُن لوگوں سے سخت چڑ ہوتی ہے جو پراپرٹی سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔

میری ہمت کی داد دیجیے کہ اس کے باوجود آگے بڑھ کر کاغذات پیش کر دیے۔ آپ جو مناسب سمجھیں مگر اسے دیکھ ضرور لیجیے۔ الٹا پلٹا، اوّل آخر دیکھا اور کچھ دھیمے پڑے۔ خدا خدا کر کے یہ ناخوش گوار ملاقات، مسکراہٹ اور ہلکی معذرت کے ساتھ ختم ہوئی۔

اپنے ساتھیوں پر اپنے مخلص ورکر پر انھیں کتنا بھروسہ تھا، اس ایک واقعے سے اندازہ کیجیے۔ ایک چھوٹی لڑکی سنگرور کے بہت بڑے خاندان کی نام لیوا ہندستان میں تھی، دُور کے اعزا اس کی ساری پراپرٹی کا کلیم پاکستان میں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہندستان کی بیوروکریسی شرناتھیوں کو اس پر قابض کر چکی تھی۔ دونوں فریق منکر تھے کہ اس خاندان کا کوئی فرد یہاں باقی ہے۔ ایک وفد میں شامل ہو کر پنڈت جی کے آفس پہنچی۔ گفتگو ختم کر کے ہم لوگ باہر نکلے تو پنڈت جی بھی

خود ساتھ ہی نکل آئے اور مجھے روک کر بولے، ذرا ایک بات سُن لو۔ سکریٹری سے ایک فائل لے کر اندر لے گئے اور کہا کیا تم اس کیس سے واقف ہو۔ میں نے کہا جی ہاں صرف میں ہی نہیں رامیشوری نہرو بہن اور ہم دونوں۔ کہنے لگے ان کا نوٹ بھی دیکھو شامل ہے۔ میں نے بتایا کہ میری ڈائری میں اس کا نام پتا عمر سب درج ہے، اور جس کے سپرد لڑکی ہوئی ہے وہ بھی اسی شہر میں موجود ہے۔ بولے مجھ سے ملا سکتی ہو؟ کل لے آؤ؟

فائل بند کر کے سکریٹری کے سپرد کی۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا، روک دیا کہ اب ان کی شہادت کے بعد کچھ سوچنے اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے دن میں بچی کو لے گئی، اپنے پاس بٹھایا، سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کی ضروریات کے لیے دو سو روپے ماہ وار بالغ ہونے تک مقرر کر دیے۔ مجھے علم نہیں اس کی پراپرٹی کا کئی سال بعد کیا فیصلہ ہوا، لیکن پاکستان کو صاف جواب مل گیا۔

کیا کچھ گناؤں۔ ابتدائی زندگی پردے میں گزارنے کی وجہ سے میں غیر مردوں سے ہاتھ نہیں ملاتی تھی۔ پنڈت جی کے یہاں کوئی دعوت تھی، میں نے کترا کر دوسری طرف نکل جانا چاہا۔ آگے بڑھ کر کہنے لگے۔ یہ کیا بغیر ہاتھ ملائے سلام کر کے کیسے نکل جاؤ گی۔ میں شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

میرے چھوٹے سے نواسے کو انھیں دیکھنے کی خواہش تھی۔ ایک بار وہ بھی ساتھ ہو گیا۔ میری خرافات سُنتے رہے پھر اُٹھے کہنے لگے چلو شیر دیکھیں۔ بچّہ بہت خوش ہوا۔ اُسے دونوں شیروں کے پاس لے گئے جو خوش ہو کر ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوئے اور اُن سے ہاتھ ملایا۔ میرا بچّہ تو ڈر کر پیچھے ہو گیا، اندرا جی کے بچّوں نے ان کی پیٹھ تھپکی، پاس کھڑے رہے۔

سنٹرل ہال میں پارلیمنٹری پارٹی کی میٹنگ تھی۔ پُرانے ساتھی اور اب کے منسٹر

مہابیر تیاگی سے زبردست جھڑپ ہوگئی، سخت گفتگو سے بڑھ کر یہ نوبت آگئی کہ تیاگی جی اٹھ کر ان کی طرف دوڑے اور بُری طرح چیخنے لگے۔ سب نے مل کر ان کو پکڑ لیا، وہ بالکل آپے سے باہر تھے۔ پنڈت جی نے کہا چھوڑ دو، چھوڑ دو، میں ان کو ہمیشہ سے جانتا ہوں۔ خیر بہ مشکل ان کو روکا گیا، لیکن میٹنگ بدستور امن و امان سے چلتی رہی۔

پارلیمنٹ میں اُن دنوں اب کی طرح تو ہنگامہ آرائی ہوتی نہ تھی، لیکن کچھ نہ کچھ چیخم دھاڑ تو ہو ہی جاتی تھی۔ اپوزیشن کی بدتمیزیوں پر ہم سب بیٹھے جلتے بھنتے رہتے، مگر پنڈت جی کھڑے ہوتے تو صرف معقول جواب اور دلائل سے ان کو قائل کرتے، کیا مجال کبھی کوئی غیر پارلیمنٹری لفظ مُنھ سے نکل جائے۔ ان کی تہذیب سب کو ٹھنڈا کر دیتی تھی۔

آں جہانی ٹنڈن جی کو تھوکنے کا مرض تھا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے اخبار کے ٹکڑے تہہ کر کر کے رکھتے جاتے۔ بھلا پنڈت جی کا ایسا کلچرڈ آدمی کیسے برداشت کر لیتا، دونوں ہاؤس کی گیلریوں اور سنٹرل ہال میں اگال دان رکھوا دیے، مگر ٹنڈن جی نہ ملنے کہنے لگے، نہ نہ یہ جمعدار کو دھونا پڑیں گے۔ اور یہ ردّی کا غذ ڈسٹ بن کی نذر ہو جاتے ہیں۔

جب پنڈت جی نے استعفا دیا ہم لوگ بہت پریشان تھے۔ پارٹی میٹنگ میں سب نے ان سے درخواست کی یہ نہ کریں۔ دوسرے دن جب ملی تو میں نے کہا آپ کے بغیر تو اس حکومت کا تصوّر کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ بولے یہ ٹھیک سہی، لیکن ایک انسان کی کتنی طاقت ہوتی ہے اور وہ کب تک بوجھ سہار سکتا ہے، یہ بھی تو دیکھنا پڑتا ہے۔ خیر وہ گھڑی تو ٹل گئی۔

مگر ۶۲ء کے الکشن جیتنے کے لیے کانگریس والوں نے اس بُری طرح انھیں استعمال کیا کہ ان کا جسم برداشت نہ کر سکا۔ ہر منڈل اور ضلع کی خواہش کہ پنڈت جی ایک بار یہاں ضرور آئیں۔ پروگرام اتنا ٹائٹ کہ ضروریاتِ زندگی کی بھی ہن میں گنجائش

نہ رکھی گئی۔ ہم سب کی خود غرضیوں نے ان کی صحت کی پروانہ کی۔ آرام و ضرورت کا خیال نہ کیا۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے ہم سب نے مل کر انھیں مار ڈالا۔ اوپر سے ہر طرف یہ سوال آپ کے بعد کون؟ بھلا یہ بھی کوئی ان سے پوچھنے کی بات تھی۔

جانے والا چلا گیا۔ لوگ آئے آتے رہے لیکن

نہ اٹھا پھر کوئی رُومی عجم کے لالہ زاروں سے

پرائم منسٹر بہتیرے بنیں گے، لیکن وہ نہ سپاہی ہوں گے نہ سپہ سالار، نہ ادیب ہوں گے نہ رائٹر۔ نہ دنیا کو پنچ شیل کا سبق پڑھائیں گے۔ نہ جمہوریت کا جھنڈا بلند کریں گے۔ وہ بہت کچھ ہوں گے مگر پنڈت جی نہ ہوں گے۔

۱۱- قدسیہ زیدی

شگفتہ چہرہ، ہنستی ہوئی آنکھیں اور کھنکتا ہوا قہقہہ۔ قدسیہ کا نام آتے ہی ایک زندگی سے بھرپور شکل نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ مشرقی و مغربی تہذیب کا حسین سنگم، لکھنؤ کی تہذیب، اخلاق اور روزمرہ کا لطیف امتزاج۔ خوش ذوقی و خوش مزاجی کا مجموعہ۔ قدسیہ نے جہاں قدیم وجدید تہذیب میں خوبصورت تال میل پیدا کرکے دونوں کا حُسن دوبالا کیا تھا، وہاں عملی زندگی میں رؤسا و عمائدین سے لے کر معمولی نوکر اور دیہاتی و ان‌پڑھ ملازمین تک اور ان سب سے جن سے کسی نہ کسی طرح ان کا تعلق قائم ہوجاتا تھا اپنے ذاتی تعلقات اتنی لطافت سے قائم رکھے تھے کہ حیرت ہوجاتی تھی۔

رنگین مزاج رؤسا کی رقص و سرود والی محفلوں کا پُرتکلف اہتمام، مشرقی دسترخوان سجانے میں ان کا اہتمام اور مغربی ڈنر ٹیبل پر ان کی نفاست مزاجیاں و لطیفے قابلِ داد تھے۔ بالکل اسی انہماک کے ساتھ پبلک کاموں میں، تھیٹر اور ڈرامے کی تیاری میں، محلّوں میں بالک ماتا سنٹر کھولنے یا کسی عمارت کی تعمیر میں، میلاد و مجلس کے انتظام میں اور اعزّہ کے شادی بیاہ میں ان کی دل چسپیاں قابلِ دید تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں خوب صورتی، جامہ زیبی اور مالی فراغت کے ساتھ حُسنِ نظر اور دولتِ علم سے بھی نوازا تھا۔ ساتھ ہی کھلا ہوا ہاتھ اور دردمند دل بھی عطا کیا تھا۔

ان کے چٹکلے، لطیفے، خالص لکھنوی انداز میں مہذب ظرافت، محفل کی جان

تھی۔ زندگی کے ہر پہلو کو انھوں نے جانچا پرکھا مگر اپنی شرافت و حمیّت کی آب و تاب میں کمی نہ آنے دی۔

ایک باوقار بیوی کی طرح اُن کا گھر بھی سکون، نظم و ترتیب اور اجتماعیّت کا نمونہ تھا۔ یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب وہ دہلی میں بھگوان داس روڈ پر رہا کرتی تھیں اور میرا قیام رفیع بھائی کے گھر کنگ ایڈورڈ روڈ (حال مولانا آزاد روڈ) پر تھا۔ اور میری اکثر ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ بھی جلد جلد آیا کرتی تھیں۔

مجھے سب سے زیادہ قابلِ تعریف ان کی طبیعت کی رنگارنگی نظر آتی تھی۔ اُن کے گھر میں نوکروں سے لے کر اعزہ اقربا تک سب کی ایک جگہ تھی۔ اپنے بچے انتہائی اہمیت رکھتے ہوئے بھی آیا یا پُرانے نوکر کا ادب کرنے پر مجبور تھے، اور اس بھابھی کا احترام ملحوظ رکھتے تھے جو ماں سے زیادہ شفیق مُمانی یا چچی کے پاس آکر مہینوں رہ سکتی تھیں۔

رفیع بھائی ان کی انتظامی اہلیت کے اس حد تک قائل تھے کہ بڑی دعوتوں میں ہمیشہ ان کے مشورے شریکِ کار رہتے تھے۔

وہ نوجوان لڑکے جنھیں ان دنوں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ان کی فیاضیوں کے مرہونِ منّت تھے۔ انھیں نہ جانے کیسے کیسے موقعوں پر انھوں نے سہارا دیا اور کس کس طرح انھیں کاروباری دُنیا میں کامیابی کے راستے دکھلائے۔

اپنی فطری سوجھ بوجھ اور ذہانت کی بدولت نوعمری ہی میں بخاری صاحب[1] اور آل انڈیا ریڈیو سے قربت نے انھیں راگوں کی پرکھ، سازوں کی پہچان اور موسیقی کے ہر اتار چڑھاؤ سے واقف کر دیا تھا اور یہی چیز ان کے ذوقِ لطیف میں اضافے کا سبب بنی۔ پھر رام پور کا ماحول اور بھی سازگار ثابت ہوا۔ گاندھی جی کی پہلی برسی پر ہم سب چاہتے

---

[1] احمد شاہ پطرس بخاری قدسیہ کے چچازاد بھائی اور تقسیم سے قبل آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل تھے۔

تھے کہ بچوں کا کوئی ایسا پروگرام ہو، جو عام راستے سے ہٹ کر اس عظیم ہستی کے شایانِ شان ہو۔ قدسیہ نے رفیع بھائی اور پنڈت جی سے مل کر ایک خوب صورت پروگرام پیش کیا۔ سنگیت اکیڈمی کی مس نرملا جوشی کی خدمات اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر حاصل کیں۔ جوش صاحب سے بہ اصرار دو خوب صورت نظمیں لکھوائیں۔ جامعہ ملیہ اور دوسرے اسکولوں سے بچوں اور نوجوانوں کو اکٹھا کیا اور اتنا خوب صورت پروگرام مرتب کیا کہ آج تک پھر کبھی نہ ہو پایا۔ اگرچہ اس کی تقلید میں اب بھی ہر سال بچوں کا میلہ ہوتا ہے۔

جامعہ ملیہ کی ڈراما سوسائٹی نے طے کیا کہ "آگرہ بازار" شہر کے اسٹیج پر دہلی والوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ قدسیہ نے کچھ سازندے اور ایکسپرٹ بلائے، نظیر کی ایک ایک غزل کی دُھن سننے اور درست کرنے میں خود اپنا وقت صرف کیا۔ میں بے وقوفوں کی طرح پاس بیٹھی سب سنتی رہتی تھی، مگر قدسیہ مطمئن نہ ہوتی تھیں۔ آخر جامعہ کے ایک نوجوان نے کہا اچھا لو اب تال سُر سے الگ ہو کر فقیر کی لحن مجھ سے سُن لیجیے۔ خوش آواز نوجوان نے پہلا ہی مصرع پڑھا تھا کہ قدسیہ پھڑک اٹھیں۔ موسیقی کے ماہرین بھی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے اور مجھے اپنی نااہلیت کا قائل ہو جانا پڑا۔

اسی طرح جامعہ کے یومِ تاسیس پر بچوں کے پارک کا نمونہ سراسر ان کی جدت ان کا مشورہ اور پنڈت جی کی خواہش پر انھوں نے پیش کیا۔ اور اس کے بعد بال بھون، بچوں کے پارک وغیرہ دہلی اور تقریباً ہر اسٹیٹ میں تیار ہوئے۔

نجی تقریبات اور محفلوں میں وہ خالص ہندستانی بیگم بن کر آیا کرتیں اور جاڑوں میں اکثر زرتار ہلکی روئی والی رضائی بھی اوڑھ لیا کرتی تھیں، جو صرف زنانہ محفلوں کی چیز تھی، مگر انھوں نے ہر قسم کی پارٹیوں میں بھی اسے مقبول بنا دیا تھا۔

جب شفیق صاحب مرحوم نے بالک ماتا سنٹر کی اسکیم تیار کی تو ان کی مجلسِ

شوریٰ میں مسز گابا اور قدسیہ مرحومہ پیش پیش تھیں۔ مسز گابا کا تو صرف مشورہ تھا، مگر قدسیہ نے مٹیا محل کے پہلے بالک ماتا سنٹر کی داغ بیل ڈالنے میں پورا ہاتھ بٹایا۔ کتابوں، کہانیوں اور بچّوں کی دلچسپیوں میں بھی ان کی مہارت ظاہر ہوئی۔ انھوں نے خود گاندھی بابا کی کہانی لکھی، کتابیں منتخب کیں۔ تھیوری شفیق بھائی کی سہی، مگر سارا پریکٹیکل ورک قدسیہ کے ذمّے رہا۔ فرنیچر کے رنگ، ڈیزائن، نرسری کی ضروریات کی خریداری انھیں کے سپرد ہوئی، اور چند دن بعد ایک خوبصورت چھوٹا سا سنٹر عوامی سطح کے بچّوں کے لیے نظر کے سامنے تھا۔ اس سلسلے میں انھیں روز ہی مٹیا محل کے چکّر لگانے پڑے۔ ٹیچرس کی نگرانی اور دیکھ بھال کا سلسلہ بھی ہفتوں جاری رہا۔

ایک سنٹر کی کامیابی دیکھ کر دوسرا اور تیسرا ابھی شفیق صاحب نے کھول دیا کیونکہ وہ کستوربا ٹرسٹ کی بال واڑی سے اونچا اور مانٹیسوری سے نیچا اسکول لوئر مڈل اور مڈل کلاس کے لیے پیش کرنا چاہتے تھے اور یہ ناممکن ہوجاتا اگر قدسیہ سوفی صدی مددگار نہ بن گئی ہوتیں۔ سستی اور خوبصورت اشیا کی خریداری میں قدسیہ نے چار چاند لگا دیے۔

اپنے رئیسانہ انداز و مزاج کے باوجود انھوں نے متوسط طبقے میں اس کو مقبول بنانے کے لیے صدیقہ مرحومہ (بیگم شفیق) کا اور میرا ساتھ ڈھونڈھا۔ اور ماؤں سے راہ و رسم بڑھا کر بچوں کو بیگم شفیق کی سپردگی میں دے دیا۔ لیکن یہ سب ہوجانے کے بعد انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔

مجھے یاد ہے شفیق صاحب سخت بیمار اسپتال میں داخل تھے۔ تعلیم و ترقی کی بلڈنگ ادھوری پڑی تھی۔ ساٹھ ستّر ہزار کے بل باقی پڑے تھے۔ کارکن پریشان تھے۔ برکت علی فراق مرحوم ہم دونوں سے ملے اور بتایا کہ شفیق بھائی کو بیماری میں ان تقاضو سے بہت تکلیف ہے۔ اپنی صحت سے ناامید ہیں اور انھیں نہیں معلوم یہ بل کیسے ادا

ہوں گے۔ اچھے ہوتے تو کوئی صورت کرتے۔

ہم نے طے کیا کہ چلو پنڈت جی کو یہ مشکل بتا آئیں۔ وہی اس کا حل نکالیں گے۔ ملاقات کا وقت مقرر ہوا اور قدسیہ اور میں ان کے آفس پہنچے۔ قدسیہ نے بتایا، وہ کام جو شہر میں ہو رہے ہیں، ان کا ہیڈ آفس شفیق صاحب جامعہ میں بنوا رہے تھے، تعلیم و ترقی کی اس بلڈنگ میں اڈلٹ ایجوکیشن، بچوں کی برادری، بالک ماتا سنٹر، رسالہ تعلیم و ترقی سب ہی کام ہوتے تھے، مگر وہ سخت بیمار اور مایوس ہیں، ہزاروں کے بل پڑے ہوئے ہیں اور تقریباً اسّی ہزار روپیہ واجب الادا ہے۔ اس مشکل سے سوا آپ کے اور کون نکال سکتا ہے۔

پہلے تو پنڈت جی خاموش سنتے رہے۔ پھر ایک دم بپھر گئے، کہنے لگے "پیسہ پاس نہیں اور اتنا بڑا کام شروع کر دیا، جامعہ سے اچھے کام کرنے والے سارے ملک میں نہیں ہیں، مگر بزنس سنس چھو نہیں گیا ہے۔ خرچ کر لیتے ہیں بلا سوچے سمجھے"۔

ان کے غصّے نے تو ہمارے حواس گم کر دیے۔ قدسیہ نے ہمت کر کے کہا "ناز نازبرداروں ہی سے کیا جاتا ہے۔ آپ کے بھروسے پر انھوں نے کرلیا ہوگا"۔

اتنا کہنا تھا کہ اور بگڑے "میرے بھروسے پر۔ میں کیا کرسکتا ہوں"۔ قدسیہ نے کہا "آپ ہی نے تو ان کی عادتیں خراب کی ہیں"۔ ہم ساکت، پنڈت جی برہم۔ کچھ دیر بعد ذرا ٹھنڈے پڑے تو پھر قدسیہ نے کہا "ہم تو بڑی امید لے کر آپ کے پاس آئے ہیں"۔ چلو اور ٹھنڈے ہوئے۔ کچھ سوچ کر بولے "اچھا ابھی میرے کمرے میں مولانا آزاد آنے والے ہیں، میں اُن سے بات کروں گا"۔

ملاقات ختم ہوگئی۔ ہم دونوں جلدی سے اُٹھ پڑے۔ قدسیہ نے اپنا ٹھنڈا برف جیسا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ادھر ہم نے جاکر شفیق بھائی کو اپنی کارکردگی سُنادی۔ دوسرے تیسرے دن ساری رقم کی منظوری ہوگئی۔

شعرا، آرٹسٹ، سوشل ورکر اور چھوٹے تعلیمی کام کرنے والے بے تکلف ان سے اپنی مشکلات کا ذکر کرتے۔ اور وہ اپنے وسیع حلقۂ احباب میں ان کی دشواریوں کا حل ڈھونڈھ لیا کرتی تھیں۔

۴۸ء سے لے کر ۶۰ء تک ہمارے تعلقات عجیب قسم کے رہے۔ کبھی بہت زیادہ اور روزانہ ملاقات کبھی اپنی مصروفیتوں کے باعث مہینوں ایک دوسرے کی خیر خبر نہیں۔ لیکن جب بھی ملتیں خوردگی و بزرگی کا احترام ملحوظ رکھتی ہوئی اتنی سادگی و پرکاری کے ساتھ کہ بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا۔

جس طرح زندگی میں انھوں نے کبھی پریشانی، مایوسی اور نا امیدی کا اظہار نہیں کیا تھا، مرتے وقت بھی اپنے مرض اور اپنی حالت کا صحیح اندازہ کر کے ڈاکٹر بلانے کو کہا ضرور مگر زیدی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر پورے سکون کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ زیدی صاحب کے علی گڑھ جانے کے بعد بہت روز سے ملاقات بھی نہ ہوئی تھی۔ خبر سُن کر علی گڑھ گئی۔ دوستوں کے دل زخمی ہوئے اور آنکھیں اشک بار، گھر کی ویرانی زیدی صاحب کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوئی لیکن حُسنِ شعر اور نغمے کا تصوّر قدسیہ کی یاد کے ساتھ ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو گیا۔

مٹی کے ڈھیر پر پھولوں کا انبار دیکھ کر ایسا لگا
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

اور

ایک غنچے کے مسکرانے سے ایک گُل کا مآل یاد آیا

۱۲- حافظ جُمّن

غالباً ۱۶ء کا زمانہ تھا، جب ایک دن ہمارے ہوٹل نما مکان میں ایک اجنبی مہمان کی آمد پر ہل چل مچ گئی۔ یہ مہمان بالکل ہمارے لیے اجنبی سہی، مگر میرے والد کے اور گھر کے دوسرے بزرگ افراد کے لیے کچھ ایسا غیر معروف بھی نہ تھا۔ لوگ بڑھ بڑھ کر اس سے بغل گیر ہو رہے تھے، مصافحہ کر رہے تھے۔ اور ہم نئی نسل کے لوگ حیران اس کھیسیں نکالے ہوئے عجیب سے نووارد کو دیکھ رہے تھے، جو آٹھ سال کی گم شدگی کے بعد کلکتے کی کسی مسجد میں اپنے بڑے بھائی کو دست یاب ہو گیا تھا۔ بھائی کے گھر لوگ اسے رو پیٹ بھی چکے تھے۔ اور اس کا سویم کا فاتحہ بھی کر دیا۔ میرے والد بہت خوش تھے، جیسے کوئی نعمتِ عظمیٰ مل گئی ہو۔ مہمان نے زنان خانے کی ڈیوڑھی کا رُخ کیا، مگر پردہ نشین ماں نے حکم دیا "ان سے کہہ دو باہر ہی رہیں۔ اندر آنے کی ضرورت نہیں۔ میں سامنے نہ آؤں گی۔ دُنیا جہان گھوم کر اب لَوٹے ہیں۔" لوگوں نے پکار کر کہا "جُمّن آئے ہیں۔" اور انھوں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر آواز دی "بھوجی سلام"، کوئی جواب نہ پاکر مکرر ارشاد فرمایا۔ نوکرانی نے کہا دُعا کہہ رہی ہیں بی بی اور پوچھتی ہیں اتنے دنوں کہاں رہے؟ کہاں مارے مارے پھرتے رہے؟ یہ مرنے کا خط کس نے لکھا تھا؟ ہنس کر [illegible] دیا "وہ تو میں نے ایسے ہی لکھ دیا تھا کہ دیکھوں مجھے کوئی یاد بھی کرتا ہے یا نہیں۔ ویسے اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ بمبئی، امراؤتی، مونگیر، راج گیر، آبو پہاڑ سب

گھوم آیا۔" اندر سے پھر سوال ہوا" بھائی کو کیسے ملے۔ ہم لوگوں کو یقین ہی نہ تھا کہ تم مر گئے ہو۔ اسی لیے تو ان کو بھیجا تھا۔" ہنس کر بولے" وہ تو ویسے ہی تار دے دیا تھا۔ میں تو ایک مسجد میں اذان دیتا تھا، آواز سُن کر بھائی نے پکڑ لیا" (ڑ کی آواز وہ کبھی ادا نہ کر سکے۔)

اس نو وارد کے کئی نام تھے، جمّن، ابراہیم، براہی، جمیل الدین وغیرہ ان گنت ناموں میں سے جمّن ان کی ماں کا رکھا ہوا نام تھا اور براہی شاید ابراہیم کا مخفف۔

ان کی آمد کوئی معمولی نہ تھی۔ میرے والد کے تو وہ دودھ شریک بھائی تھے ہی ہم سب کے بھی دوست بن گئے۔ والدین مر چکے تھے، بھائی کے گھر جا کر دو چار دن میں واپس آ گئے اور خاندان کے ایک فرد کی طرح رہنے لگے۔

اب تو روز ہی سفر کے قصّے، بزرگانِ دین کی حکایتیں، قرآن خوانی کے ساتھ نوکروں اور نوکرانیوں میں فتنہ و فساد ان کا مشغلہ بن گیا۔ آخر کار بہت سعی و سفارش اور والد مرحوم کے اصرار پر میری ماں نے ان کو اندر آنے جانے کی اجازت دے دی کیوں کہ ان کا خاندان اسی گھر کا لے پالک تھا۔ سب ہی بیویاں ان کے سامنے ہوتی تھیں اور مہمان آنے والی ہر بیوی کو وہ پردے کی اوٹ سے جھانک کر خود دیکھ لیا کرتے تھے۔ خواتین اکثر بُرا مان جاتیں اور ہم کو اس نامعقول حرکت کی معذرت کرنا پڑتی۔ مگر وہ اپنی عادت سے باز نہ آتے۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں اس بار جب حسبِ معمول میری ماں نے بچّوں سمیت میکہ سسرال کا سفر کیا تو ہمیشہ کی طرح بوا کو گھر کا منتظم بنا کر چھوڑ گئیں، لیکن حافظ جمّن بھی تو تھے، بوا کی کفایت شعاری جب اُن کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی تو انھوں نے دھوکا دھڑی سے گھی شکر حاصل کرنا شروع کر دیا۔ لڑائی اور دھینگا مشتی تک نوبت پہنچ گئی۔ ہم لوگ واپس آئے تو مقدمہ پیش ہوا۔ والد مرحوم ہنس ہنس کر حافظ جمّن کی حمایت کر رہے

تھے، زیادہ اخراجات پر والدہ کو جو اعتراض تھا اُسے نظر انداز کر کے جمّن کو حق بجانب سمجھ رہے تھے، کیوں کہ یہ ان کا حق تھا کہ صبح نماز سے پہلے وہ تر بہ تر ملیدہ کھالیں، تب خدا کے حضور سجدۂ شکر ادا کریں۔

صرف ایک کام انھوں نے اپنے سے متعلق کر لیا تھا' رات میں والد کے پیر دباتے ہوئے اپنے سفری قصے سُنانا۔ ایک روز کہنے لگے۔ بھیّا میں سوچتا تھا کہ یہ مندر میں کیا ہوا کرتا ہے۔ فر (وہ پھر کو ہمیشہ فر بولتے تھے) میں نے اپنی داڑھی مونچھ سر کے بال سب پر استرا پھروا دیا، کھڑاویں پہن اور چندن لگا کر مندر پہنچا۔ پجاری نے پوجا کے سب ڈھنگ سکھا دیے۔ دو چار روز رہا، پرساد بھی لیتا رہا۔ فر بھاگ کھڑا ہوا۔ اللہ معاف کرے۔

کبھی گیرو کے پہاڑ کی تعریف کرتے، کبھی سنگِ مرمر کی چٹانوں کا ذکر ہوتا۔ کبھی گوالیار کی ننگی سُرخ چٹانوں سے نکلتی ہوئی لُو کا حال بیان کرتے۔ کبھی بمبئی کی خوبصورت پہودنوں پر رال ٹپکاتے، کیوں کہ جب بہت خوش ہوتے تھے اکثر رال ٹپک پڑتی تھی۔ گجرات کی گجریاں، پنجاب اور مہاراشٹر کی مرد مار عورتیں، بنگال کا جادو، غرض ان کے پاس بے شمار کہانیاں تھیں۔ زندگی کے مختلف رنگ روپ دیکھ کر عقل اور تجربہ تو کیا خاک ہوا تھا، اس لئے ان کی حماقتیں اور بچّوں جیسی شرارتیں ہر روز نوکروں میں میدانِ کارزار گرم رکھنے لگیں۔ اور وہ دُہرا کھیل کھیلا کرتے تھے۔

ایک غیر معمولی صفت وہ ضرور لے کر آئے تھے، وہ گونجتی ہوئی پاٹ دار آواز میں فنِ قرات سے مبرّا ان کی قرآن خوانی تھی، کلام پاک کی ان سورتوں کی تلاوت جو فصاحت و بلاغت سے معمور ہیں اتنی خوش الحانی سے کرتے تھے کہ سننے والا مسحور ہو کر رہ جاتا۔ گھر کی بزرگ خواتین روزانہ ان سے ایک دو سورت یا عربی نعتیہ

قصیدے یا درودِ تاج سنتیں اور دُعا مانگ کر منھ پر ہاتھ پھیر لیا کرتی تھیں۔ حافظِ قرآن وہ بچپن ہی میں ہو گئے تھے، مگر خوش الحانی کا کمال باہر جا کر حاصل کیا۔ اور یہ خوش الحانی کسی خاص وقت پر منحصر نہ تھی، صبح نماز کے بعد سے چلتے پھرتے ہمیشہ جاری رہتی تھی، سوا اُن اوقات کے جب اُن کی رگِ شرارت پھڑک جاتی۔ لوگ کہتے جمّن حافظِ قرآن ہو کر کیوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔ وہ خود بھی جگہ جگہ دیواروں پر لکھتے پھرتے "وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الفَسَاد"، مگر فساد جیسے گھٹی میں پڑ گیا تھا۔ ہر کمرے کے دروازے اور دیوار پر "اللّٰہُ جَمِیلٌ وَ یُحِبُّ الجمال" گیرو یا چاک سے لکھ کر جمیل الدین کے نام سے دستخط کر دیا کرتے تھے۔ کہیں سے آنے والا کوئی خط اور ڈاک میں پڑنے والی کوئی چٹھی ان کے دستخط سے خالی نہ ہوتی تھی۔

مٹھائی کے اس حد تک شوقین تھے کہ دھوکے بازی بھی حلال سمجھتے تھے۔ والد مرحوم کے غریب اور مفلوک الحال موکّل اور احباب جب کئی کئی دن یہاں ٹھہر کر اور مفتی مقدمے بازی سے سیر ہو کر گھر واپس جاتے تو اپنے یہاں کے مخصوص تحفے، پھلوں کے ٹوکرے، مٹھائی کی ہانڈیاں انھیں تحفتاً بھیجتے۔ پھلوں کی جھابیاں تو صحیح سلامت اندر پہنچ جاتی تھیں مگر مٹھائی بلا اُن کی دست برد کے اندر نہ جا سکتی، بلکہ اکثر طالب علم لڑکوں کو بہلا پھسلا کر پیسے جمع کرتے اور لانے والے کو کرایہ یا مزدوری دے کر رخصت کر دیا جاتا۔ مٹھائی باہر ہی کھُل کر "حسابِ دوستاں در دل" ہو جاتی۔

گہرا سانولا بلکہ کسی قدر کالا رنگ، دُبلا پتلا جسم، انتہائی بدصورت، سوکھے ہوئے پیر، لانبا کرتہ اور تہہ بند پہنے ہوئے۔ حافظ جمّن جب یہ کہتے کہ اگر میرے پاس پیسہ ہو تو میں خود کسی شاہ زادی یا راجا کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہوں، تو ہم سب جھلّا اُٹھتے، ذرا آئینہ لے کر اپنا منھ دیکھو، اس صورت پر کون شاہ زادی تم سے شادی کرے گی، مگر وہ بہ ضد ہو جاتے کہ دولت ہو تو وہ ان پر عاشق ہو سکتی ہے! اللہ

کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ لڑکیاں بگڑ بگڑ کر انھیں کوستیں اور وہ ہنس ہنس کر انھیں جلاتے۔

انھیں دنوں میری ماں بیمار ہوئیں اور شہر کے مشہور حکیم نعمت رسول صاحب کا علاج شروع ہوا۔ حکیم صاحب روز کے آنے جانے والے دوست اور چودھری محمد علی کے سالے تھے۔ والدہ کو دواؤں پر دوائیں دیتے چلے جاتے تھے اور ان کی طبیعت ٹھیک نہ ہوتی تھی۔ ایک روز جھلا کر کہنے لگے آج تک اتنا گل قند میں نے کسی مریض کو نہیں کھلایا جتنا آپ کو دے رہا ہوں۔ آخر آپ کا معدہ کیا پتھر کا بنا ہوا ہے جو گل قند اثر نہیں کرتا۔ والدہ نے کہا میں تو صرف وہی پڑیاں اُبال کر پی رہی ہوں، گل قند تو کسی دن نہیں کھایا۔ تحقیقات شروع ہوئی تو پتا لگا کہ گل قند حافظ جی خود کھالیا کرتے تھے، باقی بدمزہ دوائیں والدہ کے حصّے میں آتیں۔ والدہ کو تو بہت غصّہ آیا، مگر والد مرحوم اپنے رضاعی بھائی کی اس حرکت سے بہت ہی لطف اندوز ہوئے۔ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

گرمیوں کی ایک سہ پہر کو چھوٹا سا بچّہ گود میں لیے کراہتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے، پیچھے پیچھے ایک نوجوان لڑکا چوڑی دار پاجامہ شیروانی پہنے دنّاتا زنان خانے میں داخل ہوا۔ ماں تخت سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کیسے اندر گھُسا لائے ہو۔ مگر اُن کے کان پر جوں نہ رینگی۔ یہ کہتے ہوئے اُن کے پاس تک چلے آئے کہ بھاگیے نہیں یہ نوکر آپ کے لیے لایا ہوں۔ یہ کہہ کر بچّہ نوجوان کی گود میں دے دیا۔ جب سب پریشان ہوئے تو بتایا یہ لڑکی ہے، پریشان حال ہے۔ اس کو نوکر رکھ لیجیے۔ معلوم ہوا ظالم مَردوں سے انتقام لینے کے لیے بچّہ ہونے کے بعد اس لڑکی نے مردانہ بھیس اختیار کر لیا ہے۔ نہ جانے کیسے ان کو مل گئی اور یہ یہاں لے آئے۔ لڑکی زوردار تھی، اپنی غلطی یا حماقت نے اس کے اندر اتنا زبردست منتقمانہ جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ اب

اسے مرنے مارنے کشتی لڑنے میں بھی عار نہ تھا۔ کیوں کہ اب کیا چیز تھی، جسے وہ بچانے کی کوشش کرتی۔ نہ خاندان کی لاج کا سوال تھا، نہ اپنی عزت کا۔ کھلے خزانے میدانِ کارزار میں کود پڑی تھی اور ڈھٹائی کے ساتھ دُنیا کے سامنے کھڑی تھی۔ یہ عجیب سا کیرکٹر سب کو پسند آیا۔ بچے پر حافظ جی کی شفقت و محبت نچھاور ہوتی رہی۔ لیکن پھر مجھے یاد نہیں آتا ہے، وہ کب اور کیوں ہمارے گھر سے چلی گئی، حالاں کہ حافظ حمن ہر عورت مرد کے چھپے ہوئے جرائم کی کرید میں رہتے تھے تاکہ انھیں طشت از بام کرسکیں، مگر اس سے بھی ہم دردی تھی۔

والد مرحوم جامدانی، ململ، ڈوریہ وغیرہ کے کرتے بناتے۔ ان میں حافظ حمن کا کرتہ اور ٹوپی ضرور بنتا۔ لیکن وہ دو جوڑوں سے زیادہ اپنے پاس رکھتے ہی نہ تھے، مہترانیوں اور سائیس کے خاندان سب ان کی نوازشوں سے مستفیض ہوتے رہتے۔ گرمیوں کا بستہ جاڑے شروع ہوتے ہی اور سردیوں کے لحاف رضائی گرمیاں شروع ہوتے ہی تقسیم کر دیتے تھے۔

والد کے انتقال کے بعد مہینوں ان کی یاد میں قرآن خوانی کرتے رہے، اگر صبح کا ملیدہ اور دوسرے تیسرے دن کوئی لذیذ ہانڈی چڑھانا نہ بھولے۔ بہترین کھانا پکاتے تھے، ہم سب سے اکثر پیسہ جمع کرتے کوئی خاص قیمتی کھانا پکاتے اور تبرک کی طرح محلے ٹولے تک میں تقسیم کرتے تھے۔ شادی کی حسرت اب تک پوری نہ ہوئی تھی، کیوں کہ ان کو باقاعدہ کوئی تنخواہ نہ ملتی تھی، لیکن گھر کے ہر فرد پر ان کا اتنا حق تھا کہ خورش خوراکی سے بچ کر بھی کچھ روپیہ ان کے پاس جمع ہو جاتا تھا جس سے لکھنؤ جاکر بساط خانے کا سامان لاتے اور وہ ہم سب کے ہاتھوں دُگنے داموں پر فروخت کر دیتے۔ بیچ باچ کر جو تھرڈ کلاس چیزیں بچ جاتیں انھیں مفت بانٹ دیا کرتے تھے۔

آخر کار ان کی دیرینہ تمنا اباجان کے ایک بیٹے (محفوظ احمد قدوائی) نے پوری کر دی

اور اپنی ملازمت کے دوران سیتاپور کے کسی گانو میں ان کی شادی کرادی۔ وہ گوری سی کم عمر لڑکی جب ہمارے گھر بیاہ کر آئی تو ہم سب تاسف و حیرت میں ڈوب گئے۔ بہرحال یہ گڑیا سی بچی سب کے رحم و شفقت کی مستحق تھی۔ سہاگ رات مسلسل حافظ جی نے قرآن خوانی میں گزاری اور چھوٹے دادا مرحوم کو پکار کر کہنا پڑا "جمن! اب کل پڑھ لینا۔"

بچارے اس کا بے حد خیال کرتے تھے۔ ملیدہ اب اور زیادہ گھی سے تر بہ تر ہوگیا اور دونا بننے لگا۔ اس کی مہندی، چوڑیاں اور کپڑوں کی بھی فکر ہوگئی، اور تمام دن اس کے گرد چکر لگاتے رہتے۔ مگر وائے محرومی۔ اس کی ماں جلد ہی نازل ہوگئی۔ ماں بیٹی نے چپکے چپکے بات چیت کی اور ماں بہ ضد ہوگئی کہ تھوڑے دنوں کے لیے اس کو جانے دو۔ حافظ جمن کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ ہم سب نے اس سنگ دلی پر انھیں للکارا اور اسے وعدہ وعید کے بعد روانہ کردیا۔ لیکن قسمت نے یہاں بھی دھوکا دیا۔ جب ایک دو ماہ بعد یہ اسے لینے گئے تو ماں بیٹی بھکنی اور دست پناہ لے کر دوڑیں اور انھیں گھر سے نکال کر دروازہ بند کرلیا۔

قانونی چارہ جوئی مشکل تھی۔ بہ مشکل تمام طلاق کا مطالبہ ماننے پر انھیں راضی کیا گیا۔ اور یہ چوٹ اتنی سخت تھی کہ مہینوں ٹھنڈی سانسیں بھرتے رہے۔ یہ طے کرلیا کہ اب کسی بیوہ کے ساتھ نکاح کروں گا۔

بھائی مدحت کامل جب پہلی بار ڈپٹی کلکٹر ہو کر گورکھپور گئے تو حافظ جمن مع باورچی خانے کے سامان کے ان کے ساتھ تھے، اِدھر اُدھر ذکر کرتے کرتے ایک جگہ قسمت لڑ ہی گئی اور یہ طے ہوا کہ محترمہ خود بارہ بنکی آئیں گی اور یہیں نکاح ہوگا۔ حافظ جمن واپس آئے تو بہت خوش تھے، کہنے لگے بٹیا وہ خوب گوری اور موٹی سی ہے عمر یہی کوئی چالیس کے پیٹے میں ہوگی مگر تگڑی ہے۔ صرف دو دانت گرے ہیں۔

اور پھر ایک دن دلہن اکّے پر سوار اپنے ایک ساتھی کے ساتھ تشریف لائیں۔ صورت

شکل واقعی بہتر تھی، عمر بھی ان کے لیے بے حد موزوں۔ مگر یہ غلط تھا کہ صرف دو دانت گرے ہیں، واقعہ یہ تھا کہ صرف دو دانت منہ میں باقی بچے تھے۔

جلدی جلدی سارا انتظام کیا گیا، ہم سب نے لگ کر عروسی جوڑا بھی الٹا سیدھا تیار کر دیا۔ صحن میں تخت بچھا کر دولہا دلہن کو بٹھایا۔ سید صاحب نکاح پڑھنے لگے تو نام کا سوال اٹھا، مگر وہ کسی طرح نام بتاتی ہی نہ تھی۔ لاکھ اصرار کیا اس نے بول کر نہ دیا۔ حافظ جمن کی نظر اس کے دوپٹے پر پڑی تو خاتون نام لکھا ہوا تھا۔ بس طے ہو گیا کہ یہی نام ہے اور نکاح پڑھ دیا گیا۔ مگر نہ جانے کیا تھا وہ منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ ایک ٹرنک وہ ساتھ لائی تھی۔ اس میں کچھ کھانے پینے کی میٹھی چیزیں بھی تھیں۔ ایک بار تو اس نے خود شوہر کی خاطر تواضع کی، مگر حافظ جمن کی چینٹے کی خصلت عود کر آئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بکس کھول کر کچھ کھا لیتے تھے اور وہ منہ پھلائے بیٹھی کچھ نہیں بول رہی تھی۔

نہ جانے کیا ہوا رات بمشکل کٹی۔ فجر کے وقت اس نے اپنے ساتھی سے بات کر کے اکہ منگوایا اور ہر چند حافظ جمن نے خوشامد کی، ڈرایا دھمکایا، کسی طرح نہ مانی۔ ہم لوگوں کے سمجھانے پر غصے میں کہنے لگی میں تو جس وقت سے آئی ہوں اس کی حالت دیکھ رہی ہوں یہ کیا کھا کے مجھے رکھے گا۔ میرا سارا ناشتہ صاف کرتا رہا ہے۔

ہم نے کہا تمہارا نکاح ہو چکا ہے، طلاق کے بغیر کیسے جا سکتی ہو۔ بولیں کون کہتا ہے میرا نکاح ہوا۔ میرا نام خاتون تھوڑی ہے۔ یہ لوٹا تو میں نے پرانا مول لیا تھا، میرا نکاح ہوا ہی نہیں۔

لیجیے صاحب دلہن تو روانہ ہو گئی، گاؤں والے جب راہ چلتے ملتے تو ان کی سمجھ میں نہ آتا مبارک باد دیں یا پرسا دیں۔ ہم نے مرثیہ کہا۔ بڈھی عورتوں نے حرافہ عورت کہہ کر ان کو تسکین دینا چاہی، مگر دل پر دوسرا داغ تو لگ ہی گیا کچھ دینے والے بھی باز نہ آئے۔ کچھ عرصہ پہلے رسالہ "نگار" (لکھنؤ) میں ایک افسانہ

"جمن کی موت پر رُوحوں کا اضطراب" چھپا تھا۔ اور اسے پڑھ کر ہم سب نے ان کو طعنہ دیا تھا کہ تم جب مرو گے تو رُوحوں میں ایسی ہی ہل چل مچے گی۔ مگر وہ کہتے تھے، کوئی بات نہیں۔ یہاں نہ سہی وہاں تو ضرور حوریں ملیں گی۔ بدصورتی اور بڑھ گئی، ٹھنڈے پانی سے تہجّد اور فجر کے لیے وضو کرتے کرتے ایڑیاں پھٹ گئی تھیں، اور جب میں نے ان میں لگانے کے لیے گلیسرین دی، تو وہ بھی کم بخت میٹھی نکلی۔ اس لیے بڑی سی شیشی چند دن میں صاف ہو گئی۔

آخری زمانے میں تمام رات مراقبے میں بیٹھے رہتے۔ تہجّد، فجر، اشراق سے لے کر رات تک نمازوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ اب ہانڈی بھی ذرا کم ہی چڑھتی تھی۔ ہماری فرمائش پر کوئی نہ کوئی چیز پکا دیا کرتے۔ میرے بھائی مصطفیٰ کامل کی مہربانی نے ٹکٹ بھیج کر انھیں جدّہ بلوا کر حج بھی کروا دیا تھا اور اب وہ حاجی حافظ جمن تھے، کمزوری روز بہ روز بڑھ رہی تھی، مگر کسی طرح ڈاکٹر کو دکھانے پر راضی نہ ہوتے تھے، اپنا خود ساختہ علاج کرتے رہتے۔ قرآن خوانی اور زیادہ بڑھ گئی تھی مگر آہستہ۔ شاید آواز میں زور نہ رہا تھا۔ مگر جب اذان دینے کھڑے ہوتے سننے والوں کو لطف آ جاتا۔ پڑوس کی مسجد میں اذان خود ہی دیتے تھے۔

آخر کار ان کی گرتی ہوئی حالت دیکھ کر میں نے باہر سے ڈاکٹر بلوایا۔ ڈاکٹر نے دس روپے فیس لی اور سات روپے میں دوائیں دیں۔ ایک ایک سے کہتے تھے آج اتنے روپے مجھ پر خرچ کر دیے گئے۔ بے کار۔ مگر دوا استعمال کر لی۔

پھر بھائی کے گھر اٹھ گئے۔ اور دوسرے دن جب میں گئی تو انھیں دیکھ کر اپنی ساری زیادتیاں یاد آ گئیں۔ وہ اب ہم سے رخصت ہو رہے تھے۔ دوسری بار حج کرنے کے لیے جو پیسہ جمع کیا تھا مجھے دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کتنی محبت انھیں ہم سب سے تھی۔ اور اس کا بدلہ ہم انھیں کچھ نہ دے سکے۔

۱۳- ڈاکٹر سیّد عابد حسین

وہ ایک دور تھا، جب قوم پرستی کی ٹکسال میں انسان گڑھے جاتے تھے جب ہماری تعلیم گاہیں اہلِ علم و دانش سے بھرپور تھیں۔ جب حصولِ علم کا مقصد صرف سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ عہدوں پر پہنچنا رہ گیا تھا، مگر چند سر پھرے دانش و راس کو بکاؤ چیز نہ سمجھ کر گوشۂ عافیت ڈھونڈھ رہے تھے، ساتھ ہی سیاسی افق پر انسان دوستی اور درویشی کی فضا چھائی ہوئی تھی۔

ایسے میں مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور گاندھی جی نے جامعہ ملیہ کے نام سے دولت و زر سے بے پروا، آرام و راحت سے بے نیاز، محنت و کام کے شوقین اور تن من دھن سے تعمیرِ ملت و وطن میں جٹ جانے والے نوجوانوں کو ایک عملی میدان فراہم کیا۔ ان میں سے کوئی ابتدائی تعلیم کا ماہر تھا، تو کوئی ایڈلٹ ایجوکیشن کا شیدائی۔ کوئی زبان و بیان کا ماہر تھا، تو کوئی ماہرِ تعمیرات۔ کسی کے دماغ میں حدیث و فقہ کا نور فروزاں تھا، تو کسی کے اندر فلسفہ و ہیئت کی کاوشیں۔ یہ سب صرف ہندستان کے قصبوں اور دیہاتوں ہی سے نہیں غیر ملکوں سے بھی آکر یہاں اکٹھے ہوئے تھے تاکہ ایک عدیم النظیر برادری قائم کرسکیں۔ ان میں بچوں کے شاعر بھی تھے اور بچوں کے سُدھار و سرپرستی کا سودا رکھنے والی خاتون بھی۔

ڈاکٹر عابد حسین بھی انھیں میں کے باقیات الصالحات میں سے تھے۔ وقت

گزرتا گیا۔ محفل اجڑتی رہی۔ بساط اُٹھ گئی۔ اور آج وہ شمع بھی بجھ چکی ہے ؎

رو رو کے گزاری شب غم شمع نے لیکن
نیند آہی گئی جنبش دامانِ سحر سے

میں نے ۱۹۴۷ء میں انھیں پہلی بار جامعہ کی خانقاہ میں فرش پر بیٹھے ہوئے، کتابوں اور کاغذوں سے گھرے ہوئے دیکھا تھا۔ فاؤسٹ کے مترجم اور مشہور افسانہ نویس صالحہ عابد حسین کو دیکھنے، ملنے اور قربت کی خواہش جامعہ ملیہ لائی۔ لیکن یقین ملنیے، عابد صاحب کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ عالم تصور میں نہ جانے ان کا کیا حلیہ تھا۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگا کہ جیسے اس منحنی جسم میں سب کچھ دکھاوے کا ہے، صرف دماغ ہی دماغ ہے۔ باعمل، متحرک، باشعور اور مقناطیس کی طرح منظر اور پس منظر کو کھینچنے والا۔

کچھ ہی عرصے بعد میں نے محسوس کیا کہ انجمن جامعہ ملیہ ہو یا مجلس منتظمہ، علمی و ادبی محفل ہو یا گھریلو نشست، عابد صاحب کسی جگہ اَن فِٹ نہ تھے۔ ان کی ہمہ دانی تاریخ، ادب، مذہب، سیاست، کھیل کود اور لطائف وظرائف سب پر بھاری ہوتی تھی۔

ان کی صائب رائے اکثر معاملات کو سلجھانے اور مسئلوں کو حل کرنے میں مدد ومعاون بن جاتی تھی۔ ۵۴ء تک ان سے جب تک ملنے کا اتفاق ہوتا رہا، ان کی معلومات سے فائدہ اٹھانے والوں میں پرانی اور نئی نسل کے بیشتر افراد شامل تھے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں عابد صاحب دماغ تھے، عقل تھے، علم تھے، لیکن یہ مجھے بہت دن بعد معلوم ہوا کہ وہ صاحبِ دل بھی ہیں، ایک درد مند حساس دل، جس میں دوسروں کے جذبات کا انتہائی احترام بھی موجود ہے۔ اور انھیں کسی کی تعلیم کی فکر ہے، کسی کی شادی اور غم سے بھی متاثر ہیں۔ وہ ایک فرد کے نہیں بلکہ کنبے کے سرپرست بھی ہیں۔

ان کی زبان کی کمی اکثر صالحہ بہن پوری کیا کرتی تھیں۔ اور سوچتی ہوں کتنا بڑا

نقصان ہوتا اگر انھیں صالحہ جیسی بیوی نہ ملی ہوتی۔
مزاج میں اتنا صبر و سکون اور ٹھہراؤ تھا کہ انتہائی اشتعال انگیز گفتگو میں بھی کبھی کوئی تلخ جملہ نہ کہا۔ میں بھی کبھی کبھار اپنا دکھڑا اپنے مسائل لے کر ان کے پاس گئی ہوں، اُن دنوں تو اکثر معاملات درپیش رہتے تھے جب تعلیم و ترقی سے میرا تعلق تھا اور جامعہ کے نام سے سوشل ویلفیر کا ایک پروجکٹ حاصل کیا تھا۔ مخالفت و موافقت کے اس ہنگامے میں درمیانی راستہ نکالنے والے اکثر عابد صاحب ہوا کرتے تھے میں نے اپنی کتاب "آزادی کی چھاؤں میں" انھیں پیش کی۔ یہاں انھیں پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ مسودہ اپنے ساتھ جرمنی لے گئے۔ اور وہاں سے اپنی رائے لکھ کر بھیجی۔ وہ کوئی اتنا اہم کام نہ تھا جسے جرمنی کی مصروفیت میں یاد رکھتے، لیکن دل دہی اور دل داری تھی جس نے "گوشۂ چشمے بما کنند" کی طرف متوجہ کر دیا۔
جامعہ کے عشاق اور لائف ممبر میں عابد صاحب کا شمار سابقین اولین میں تھا۔ آپ میں سے بہتوں کو علم ہوگا کہ علمی میدان میں انھوں نے کتنے جواہر ریزے بکھیرے ہیں۔ فلسفے کی گہرائیاں، فکر کا تنوع، شعور کی بیداری کے نمونے ان کی تحریروں سے روشن ہیں۔ لیکن ان کا آخری کارنامہ "اسلام اینڈ ماڈرن ایج سوسائٹی" اور رسالہ "اسلام اور عصر جدید" ہم جیسے ہزاروں کے لیے سرمۂ بصیرت بن گیا ہے۔
اب اس یادگار کو کون قائم رکھے گا؟ اتنی وسعت و کاوش کون کرے گا؟ اس کے لیے شاید ہمیں ابھی کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن مجھے یقین ہے ان کے شاگردوں کی صف میں کوئی نہ کوئی تو "حریف مرد افگن عشق" ضرور ہی نکلے گا جو عصر جدید کی اس آواز کو بلند کر سکے کیوں کہ اس سر پھرے ماحول میں قدیم و جدید کے حسین امتزاج کے ساتھ تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں کو جھنجھوڑنے کی ضرورت اب بھی ہے۔
میں نے کئی کیا اور کیوں؟ والے پڑھے دماغوں کو یہ رسالہ پڑھنے کو دیا اور

ان سب نے متفقہ طور پر اس کی افادیت و ضرورت کو تسلیم کیا۔

آخری دَور میں بیسیوں معاملات ہوں گے جن سے موجودہ حالات میں انھیں اختلاف ہوگا۔ نہ جانے کتنے عزائم ہوں گے، کتنی حسرتیں ہوں گی جو پوری نہ ہوسکی ہوں گی، لیکن جامعہ کے معاملات سے آخر تک قربت و دلچسپی قائم رہی۔ بیماری میں بھی۔ لیٹے لیٹے حال چال پوچھ ہی لیا کرتے تھے۔

افلاس و فقر کا ابتدائی دور گزر چکا تھا، گھر بھی اب نسبتاً بڑا تھا۔ میز کرسی اور الماریاں بھی تھیں مگر عابد صاحب کی سادہ، بے کار اور فقیرانہ طرزِ رہائش میں مجھے کبھی کوئی فرق نظر نہ آیا۔ تمام تفکرات، علائق، ایسا لگتا ہے وہ اپنے گوشۂ عافیت کی طرف جاتے ہوئے دامن سے جھاڑ دیتے تھے اور اس کا سہرا صالحہ کے سر تھا جو بہت ساری ذمّے داریاں حتیٰ کہ بخشیں تک اپنے سر لے کر ان کو فارغ البال کر دیتی تھیں۔

میری آخری ملاقات بہت ہی مایوس کن تھی۔ لکھنؤ جاتے ہوئے یہی سوچتی رہی کہ اب شاید ہی ملنا ہو سکے۔ عجیب اتفاق کہ اس دن خواجہ احمد عباس کی بہن بھی موجود تھیں، عابد صاحب کو نیند کی دوا مل چکی تھی اس لیے زیادہ وقت انھیں سے بات چیت کرنے میں گزارا۔ اور یوں اس دن راہِ عدم کے دو مسافروں سے ملنا ہوا۔ ان میں ایک لبِ دم تھا اور ایک تندرست مگر تندرست نے قدم پہلے اٹھا دیے! اللہ کی مرضی

جامعہ اب نئے ہاتھوں میں ہے۔ نئے زمانے کے نئے عزائم ہوں گے، لیکن کچھ بڑی بات نہ ہوگی اگر ماضی کے جھروکے سے آنے والی روشنی کو بھی چراغِ راہ مان لیا جائے۔ اور یہ روزن بند نہ کیے جائیں۔

" خدا رحمت کند آں عاشقانِ پاک طینت را "